© rasailojaraid.com

پاکستان میں "وسطی ایشیا"* کا مطالعہ

اور

اس کی مختلف جہتیں

"وسطی ایشیا" کے بارے میں پاکستان کے اہل علم کی دلچسپی کا جائزہ لینے سے پہلے یہ ضروری محسوس ہوتا ہے کہ "وسطی ایشیا" اور برصغیر پاکستان و ہند کے درمیان تاریخی، تہذیبی و ثقافتی اور دینی رشتوں پر ایک نظر ڈال لی جائے۔

ا

"وسطی ایشیا" اور برصغیر کے درمیان روابط زمانہ قدیم سے قائم ہیں۔ اثری اکتشافات سے معلوم ہوتا ہے کہ ۶۰۰۰ ق - م سے لے کر ۲۵۰۰ ق - م کے دور میں ان دونوں خطوں کے درمیان تجارتی روابط تھے۔ کاروان آتے جاتے تھے اور اشیائے خرید و فروخت کے ساتھ دونوں خطوں کے لوگ ایک دوسرے کی تہذیب و ثقافت سے آگاہ تھے، تاہم باہمی روابط کا بھرپور اظہار ظہور اسلام کے بعد ہوا اور دونوں خطوں کی تاریخ میں اشتراک کا عنصر بڑھ گیا۔ تقریباً ایک ہی زمانے میں دونوں خطوں میں اسلام کا پیغام پہنچا۔ حضرت عمرؓ کے دورِ خلافت میں مسلم مجاہدین کے قدم ایک طرف خراسان تک پہنچ گئے

---

*"وسطی ایشیا" کی سیاسی اور جغرافیائی اصطلاح کے بارے میں اہل قلم باہم متفق نہیں۔ بعض اہل قلم کے ہاں "وسطی ایشیا" ترکستان کے مترادف ہے۔ کچھ دوسرے اہل قلم "وسطی ایشیا" میں ترکستان کے ساتھ قفقاز کو بھی شامل کرتے ہیں۔ دور جدید کے علمی اور تحقیقی اداروں نے "وسطی ایشیا" کی حدود میں بحیرۂ کیسپین کے مشرق میں سابق سوویت یونین کی نو آزاد پانچ مسلم ریاستوں، سنکیانگ (عوامی جمہوریہ چین) اور افغانستان کو شامل کیا ہے۔ بعض حضرات ترکی اور ایران کو بھی "وسطی ایشیا" کا حصہ سمجھتے ہیں۔ زیر نظر مقالے کے حوالے سے "وسطی ایشیا" سے مراد وہ خطہ ہے جو سابق سوویت یونین کی نو آزاد پانچ مسلم ریاستوں - قزاقستان، ترکمانستان، کرغیزستان، ازبکستان اور تاجکستان - کے ساتھ آذربائیجان پر مشتمل ہے۔

© rasailojaraid.com

© rasailojaraid.com

تھے تو دوسری طرف مکران اُن کے زیر نگین تھا۔ برصغیر اور فارس کے ساتھ تجارتی اور فوجی رابطہ قائم رکھنے کے لیے شطّ العرب کے کنارے ۶۳۷ء میں بصرہ کی چھاونی بسائی گئی۔ اُسی سال والیٔ خراسان عبداللہ بن زیاد نے "وسطی ایشیا" میں پیش قدمی کی۔ دریائے جیحوں کے پار بخارا، سمرقند اور ترمذ پر مسلم بالادستی قائم ہوئی۔ دوسری طرف برِصغیر پاکستان و ہند پر فوج کشی سے پہلے "ابن حیلہ" سے رپورٹ طلب کی گئی جس نے ملک کی ویرانی، سرزمین کی خرابی، اہل وطن کی بے وفائی کا نقشہ کچھ اس طرح کھینچا کہ خلافت راشدہ کی طرف سے برصغیر پر فوج کشی کا ارادہ ترک کر دیا گیا۔

حضرت عثمانؓ کے عہد میں اُس الفتنۃ الکبریٰ نے جنم لیا جس نے نہ صرف فتوحات کا سلسلہ روک دیا بلکہ امتِ مسلمہ کی قوت باہمی اختلاف و انتشار میں ضائع ہونے لگی۔ یہ انتشار تقریباً ۴۵ سال بعد ختم ہوا اور ولید بن عبدالملک کے عہد خلافت میں لشکر اسلام نے ایک بار پھر پیش قدمی شروع کی۔ قتیبہ بن مسلم باہلی نے خطہ ماوراء النہر کے اُن مقامی حکمرانوں کی سرکوبی کی جو مرکز خلافت میں تبدیلی کے ساتھ ہی معاہدوں سے روگردانی کر لیتے تھے۔ قتیبہ نے ماوراء النہر پر گرفت مضبوط کرنے کے ساتھ کاشغر اور پھر چین پر لشکر کشی کی۔ ولید بن عبدالملک کے عہد ہی میں محمد بن قاسم نے سندھ میں اسلام کا پرچم لہرایا۔ دونوں سپہ سالار اپنی فتوحات کو مستحکم کر رہے تھے کہ ولید کی رحلت پر سلیمان بن عبدالملک سریر آرائے خلافت ہوا اور معمولی سے اختلاف کے ساتھ دونوں جرنیلوں کا انجام یکساں طور پر عبرت ناک ہوا۔

برصغیر پاکستان و ہند میں مسلم اقتدار جو محمد بن قاسم کی جدوجہد سے قائم ہوا تھا، وقت کے ساتھ کمزور ہوتا چلا گیا اور ایک ایسا وقت آیا جب اس کا خلافتِ اسلام سے کوئی تعلق نہ رہا۔ اسماعیلی داعیوں نے سندھ اور ملتان کو اپنی سرگرمیوں کی آماج گاہ بنا لیا۔ دوسری طرف "وسطی ایشیا" کے والی خلافت اسلامیہ کی گرفت سے آزاد ہو چکے تھے اور اپنے معاملات میں کلیتہً آزاد تھے تاہم اُنھوں نے خلافت کی اطاعت کا زبانی ربط قائم رکھا۔ "وسطی ایشیا" کے مہم جُو حکمران ایک دوسرے کے خلاف لڑتے رہے اور مختلف حکومتیں بنتی اور بگڑتی رہیں۔ ان میں سے ایک "امارت" ۸۷۲ء میں اسماعیل سامانی نے قائم کی تھی جس کا دارالحکومت بخارا تھا۔ سامانی امارت کی حدود میں ماوراء النہر، خراسان اور ایران کے کچھ حصے شامل تھے۔ سامانی امیر احمد بن اسماعیل کا ایک ترک غلام الپتگین تھا جسے امیر نصر بن احمد نے اُس کی خدمات جلیلہ کے پیشِ نظر آزاد کر دیا تھا۔ بعد میں الپتگین سامانی حکمرانوں کی باہمی چپقلش میں ایک فریق کا ساتھی بن گیا اور جب اُس کا حمایت یافتہ فریق امارت حاصل نہ کر سکا تو الپتگین نے اسی میں بہتری سمجھی کہ بخارا سے دُور رہے چنانچہ اُس نے غزنی میں قسمت آزمائی کی اور اپریل ۹۶۲ء میں "امارتِ غزنہ" کی بنیاد رکھی۔ اِس "امارت غزنہ" کے حاکموں —— سبکتگین اور سلطان محمود (بن سبکتگین) نے ہندو شاہی حکمرانوں کے خلاف فوج کشی کی اور پنجاب اُن کے اقتدار میں آ گیا۔ (۱۰۲۱ء) پنجاب

© rasailojaraid.com

© rasailojaraid.com

تقریباً پونے دو سو سال "امارتِ غزنہ" کا حصہ رہا۔ امارتِ غزنہ کی طرف سے "نائب السلطنت" لاہور میں رہنے لگا تھا اور آخر میں جب "امارتِ غزنہ" کا آفتاب غزنی میں غروب ہوگیا تو انہوں نے مستقل طور پر لاہور ہی کو پایہ تخت بنالیا تھا۔ غزنویوں کے زوال کے ساتھ غوریوں کا سورج طلوع ہوا۔ انہوں نے غزنوی روایت کے مطابق پنجاب پر قبضہ قائم رکھا۔ شہاب الدین محمد غوری کے پنجاب میں قتل پر اُس کے ایک ترک غلام نے برصغیر میں پہلی آزاد مسلم سلطنت کی بنیاد رکھی۔ (۱۲۰۶ء)

جب پنجاب غزنی اور غور کی امارتوں کا حصہ تھا تو نہ صرف ان علاقوں سے ہر طبقۂ زندگی کے لوگوں نے پنجاب کا رُخ کیا بلکہ ایران اور "وسطی ایشیا" کے تاجر، شعراء، علماء و مبلغین، سپاہی پیشہ لوگ اور سیاح بھی جوق در جوق آکر پنجاب میں آباد ہونے لگے۔ شیخ اسماعیل بخاری لاہوری پہلے اہم مبلغِ اسلام تھے جو اپنی جنم بھومی "بخارا" سے لاہور وارد ہوئے تھے۔ لاہور علم و فضل کا بڑا مرکز بن گیا تھا۔ نائب السلطنت ابراہیم کا ایک وزیر ابو نصر فارسی علم و ادب کا مربی تھا۔ اُس نے لاہور میں ایک خانقاہ قائم کی جو تشنگانِ علوم کا مرجع تھی۔ "تاریخِ سلاطین آلِ غزنین" کے الفاظ میں [1]

> وجوق جوق تشنگانِ علوم از سائر بلادِ ہند و ولایت ہائے کاشغر و ماوراء النہر و عراق و بخارا و سمرقند و خراسان و غزنی و غیر ذلک ازاں خیرات منبع متنفع می شدند چنانکہ یک آبادانی نو در حدودِ لاہور پدید آمد۔

غزنوی دور میں جہاں لاہور راسخ العقیدہ علماء و مشائخ کے لیے اپنے اندر کشش رکھتا تھا، وہیں عقلیت پسند دانش وروں کی آمد و رفت بھی جاری رہی۔ "امارتِ غزنہ" کے بانی سبکتگین کے زمانے میں اسماعیلی داعیوں کی سرگرمیاں بہت بڑھ گئی تھیں جن کے نتیجے میں سامانی امارت ختم ہوئی تھی۔ اسماعیلی دعاۃ نے اپنی دعوت کو فلسفہ کے ساتھ مدغم کر رکھا تھا۔ [2] بوعلی سینا اور البیرونی جیسے اہلِ دانش اسماعیلی تحریک سے وابستہ تھے [3] اور فلسفہ و حکمت میں ایک بلند مقام کے حامل تھے۔ بوعلی سینا کے زمانے میں اور بعد میں بھی عراق و خراسان میں فلاسفہ پیدا ہوئے مگر جو قبولِ عام بوعلی سینا کو حاصل ہوا وہ کسی دوسرے کو حاصل نہ ہوسکا، حتیٰ کہ اُس کا مرتبہ نظام فلسفہ آج "اسلامی فلسفہ" سمجھا جاتا ہے۔

سلطان محمود غزنوی کو جب اسماعیلی باغی تحریک کے مضرات کا اندازہ ہوا تو اُس نے اس کی بیخ کنی کی کوشش کی۔ پہلے ملتان کی طرف توجہ دی اور اس کے بعد خوارزم کی طرف متوجہ ہوا۔ ۱۰۱۲ء میں فاطمی خلیفہ مصر نے مشرق میں اسماعیلی تحریک کی تنظیم کے لیے ایک سفیر روانہ کیا جسے محمود نے بڑی بے عزتی سے قتل کرادیا اور ساتھ ہی اسماعیلی داعیوں کی سرگرمیوں کی نگرانی شروع کردی۔ خوارزم میں بوعلی سینا تحریک کا سرخیل تھا۔ محمود غزنوی نے اُسے بلطائف الحیل قابو کرنا چاہا مگر وہ خوارزم سے نکل بھاگا اور مختلف درباروں میں ہوتا ہوا آخر اصفہان جا پہنچا جہاں علاء الدولہ نے جو ایک خلافت بیزار شعوبی تھا، اُس کی قدر و منزلت کی۔ وہیں ۱۰۳۶ء میں بوعلی سینا کا انتقال ہوا۔

© rasailojaraid.com

© rasailojaraid.com

محمود کو خوارزم کے معاملات میں اُس وقت مداخلت کا موقع مل گیا جب درباریوں نے اُس کے بہنوئی ابو العباس مامون کو قتل کر دیا تھا۔ (۱۰۱۶ء) خوارزم کی فتح کے بعد محمود کو جن لوگوں پر ذرا سا بھی شبہ تھا، انہیں سخت سزائیں دیں۔ انہیں معتوبین میں ابو ریحان البیرونی بھی تھا جسے جلاوطن کر کے برصغیر بھیج دیا گیا۔ لاہور میں ابو ریحان البیرونی نے مسعود غزنوی کے نام پر "قانونِ مسعودی" مرتّب کی۔ البیرونی کی کتابوں میں "فی تحقیق ماللہند" ہندوستان کے مذہب، فلسفہ و ادب، رسم و رواج، علوم اور قانون کا دائرۃ المعارف ہے۔ صدیاں گزرنے کے باوجود اس کی غیر جانبدارانہ تحقیقات دادِ تحسین وصول کر رہی ہیں۔

۱۲۰۶ء میں قطب الدین ایبک نے برصغیر پاکستان و ہند میں باقاعدہ مسلم سلطنت کی بنیاد رکھی اور مسلم اقتدار ۱۸۵۷ء تک نشیب و فراز سے گزرتا ہوا قائم رہا۔ برصغیر اور بالخصوص شمالی علاقوں کے حکمران خاندانوں میں سیّدوں، لودھیوں اور سوریوں کے علاوہ سب ہی کا تعلق کسی نہ کسی واسطے سے "وسطی ایشیا" سے تھا۔ یہ لوگ نسلاً ترک تھے، اِن کی مادری زبان ترکی تھی مگر اِن کے درباروں میں فارسی کو پذیرائی حاصل ہوئی۔ یہی روایت "وسطی ایشیا" میں پروان چڑھی تھی۔ تفسیر و حدیث اور ایک حد تک عقائد و تصوّف کے لیے عربی زبان اپنائی گئی مگر تاریخ و ثقافت کے لیے فارسی کو قبولِ عام حاصل رہا۔ "وسطی ایشیا" کے سامانی، سلجوقی، خوارزم شاہی، ایلخانی اور تیموری ادوار میں نہ صرف ایران و خراسان میں فارسی شعر و ادب نے ترقّی کی بلکہ ترکوں کے درمیان جعفر بن محمد رودکی (م ۹۵۴ء)، افضل الدین خاقانی شروانی (م ۱۱۹۹ء)، نظامی گنجوی (م ۱۲۰۹ء)، مجیر بیلقانی (م ۱۱۹۸ء)، رشید الدین وطواط (م ۱۱۸۲ء)، اوحدی مراغی (م ۱۳۸۳ء)، کمال خجندی (م ۱۴۰۵ء) جیسے شعراء کا تعلق آج کے "وسطی ایشیا" سے ہے۔ اسی طرح عبدالرزاق سمرقندی (م ۱۴۸۲ء) اور دولت شاہ سمرقندی (م ۱۴۹۴ء) نے اُس زمانے میں فارسی تالیفات کے ذریعے نام کمایا جب تیموریوں کے زیرِ اثر ترکی زبان کا رواج بڑھنے سے فارسی ادب انحطاط کا شکار ہو چکا تھا۔

"سلطنتِ دہلی" کے بیسیوں فارسی شعراء میں فضل ملتانی، ناصری، روحانی سمرقندی، بدر چاچ وہ معروف شعراء ہیں جو "وسطی ایشیا" میں پیدا ہوئے اور نقلِ وطن کر کے برصغیر آ گئے تھے۔ امیر خسرو خود تو پٹیالی میں پیدا ہوئے تھے مگر اُن کے والد سیف الدین باہر سے آئے تھے۔ نثر نگاروں میں "جامع الحکایات ولوامع الروایات" اور "لباب الالباب" کے مؤلف سدید الدین محمد عوفی بخارا کے رہنے والے تھے۔ ماوراء النہر اور خراسان کے مختلف شہروں میں زندگی کا ایک حصہ گزار کر برصغیر آئے تھے اور پہلے ناصر الدین قباچہ اور پھر سلطان شمس الدین التتمش کے دربار سے وابستہ ہوئے۔ شعر و ادب سے ہٹ کر مسجد و خانقاہ پر نگاہ ڈالی جائے تو "وسطی ایشیا" کی نمائندگی متاثر کن ہے۔

© rasailojaraid.com

© rasailojaraid.com

برصغیر پاکستان و ہند میں سلسلۂ چشتیہ کی بنیاد خواجہ معین الدین چشتی (م ۱۲۳۶ء) نے رکھی تھی۔ وہ سجستان کے رہنے والے تھے مگر انہوں نے علومِ دینیہ کی تحصیل سمرقند میں کی تھی۔ اُن کے خلیفہ خواجہ قطب الدین بختیار کاکی (م ۱۲۳۵ء) کا تعلق فرغانہ کے قصبہ اوش سے تھا۔ ایک اور چشتی بزرگ قاضی حمید الدین ناگوری (م ۱۲۹۶ء) کے والد شہاب الدین غوری کے عہد میں بخارا سے دہلی آئے تھے اور وہیں فوت ہوئے۔ خواجہ نظام الدین اولیاء (م ۱۳۲۵ء) بدایوں میں پیدا ہوئے مگر تذکرہ نگارِ اس امر پر متفق ہیں کہ اُن کے اجداد بخارا سے ترکِ سکونت کر کے برصغیر تشریف لائے تھے۔

سہروردی سلسلے کے پیش رو شیخ بہاء الدین زکریا ملتانی (م ۱۲۶۶ء) ہیں۔ اُن کی کوششوں سے یہ سلسلہ سندھ، ملتان اور بلوچستان میں مقبول ہوا۔ شیخ بہاء الدین زکریاؒ لیّہ (ضلع مظفر گڑھ) سے ۱۶ میل کے فاصلے پر ایک گاؤں کوٹ کروڑ میں پیدا ہوئے تھے مگر اُن کے ننھیال کا تعلق ترمذ سے تھا اور خود اُن کے دادا کمال الدین علی شاہ قریشی خوارزم سے ملتان آئے تھے۔ شیخ بہاء الدین زکریا نے تعلیم اپنے اجداد کے وطن "وسطی ایشیا" کے شہروں میں حاصل کی۔ اِسی طرح سہروردی بزرگ شیخ جلال الدین مخدوم جہانیاں جہاں گشت (م ۱۳۸۴ء) کے جدِّ امجد سیّد جلال الدین سرخ بخاری (م ۱۲۹۱ء) بخارا سے ۱۲۴۷ء میں اُوچ آئے تھے۔ مخدوم جہانیاں جہاں گشت نے بہت سیر و سیاحت کی تھی۔ اگرچہ اُن کے نام سے جو سفر نامے متداول ہیں، سراسر جعلی ہیں، [۴] مگر اُن کے ملفوظات میں عالمِ اسلام کے مختلف بلاد و امصار کے بارے میں اُن کے تاثرات کا ذکر ملتا ہے۔ اِسی طرح اُن کے متوسّلین بھی "وسطی ایشیا" کے سفر کرتے رہے تھے۔ اُن کے مجموعۂ ملفوظات "سراج الہدایت" کے مرتب کا بیان ہے کہ جب وہ سمرقند پہنچا تو اُسے معلوم ہوا کہ حضرت مخدوم سمرقند گئے تھے۔ اُن سے بھنگے کے استعمال کے بارے میں دریافت کیا گیا تو اُنہوں نے اس کے مباح ہونے کا فتویٰ دیا۔

نقشبندی سلسلے نے "وسطی ایشیا" کی فضا میں ترقی کی تھی۔ یہ سلسلہ جو وہاں "سلسلۂ خواجگان" کے نام سے معروف ہے، خواجہ احمد اتا یسوی (م ۱۱۶۶ء) کے نام منسوب ہے۔ اُن کے بعد خواجہ عبد الخالق غجدوانی (م ۱۱۷۹ء) نے سلسلے کی اشاعت و توسیع میں بڑا کام کیا لیکن اِس سلسلے کی مقبولیت میں خواجہ بہاء الدین نقشبند (م ۱۲۸۸ء) کی توجہات اور سرگرمیوں کو سب سے زیادہ مقبولیت حاصل ہوئی اور اُن ہی کے نام پر "سلسلۂ نقشبندیہ" مشہور ہوا۔ خواجہ باقی باللہ (م ۱۶۰۳ء) اس سلسلے کو برصغیر پاکستان و ہند لائے تھے۔ وہ ۱۵۶۴ء میں کابل میں پیدا ہوئے تھے مگر کابل سے سمرقند چلے گئے تھے اور وہاں سے ایران و عراق ہوتے ہوئے برصغیر آئے۔ خود فرمایا کرتے تھے۔ [۵]

این تخمِ پاک را از سمرقند و بخارا آوردیم و در زمین برکت آگین ہند کشتیم

خواجہ باقی باللہ کے مرید و خلیفہ شیخ احمد مجدّد سرہندی (م ۱۶۲۴ء) نے اِس سلسلے کو چار چاند لگا

© rasailojaraid.com

© rasailojaraid.com

دیے اور سلسلہ نقشبندیہ مجدّدیہ کو برصغیر سے باہر افغانستان میں پذیرائی حاصل ہوئی۔ ملا شور بازار (کابل) کا خانوادہ اسی سلسلے سے تعلق رکھتا ہے۔

مذکورہ بالاسلاسلِ تصوّف سے متعلق صوفیاء نے نہ صرف دین کی اشاعت میں حصہ لیا۔ مخلوقِ خدا کو توحید کا درس دیا، باہم محبت سکھائی بلکہ انہوں نے اپنی تالیفات، ملفوظات اور مکتوبات کے ذریعے فارسی ادب کو بھی مالامال کیا۔ برصغیر کے حکمران خانوادوں کی مادری زبان ترکی تھی مگر سرکاری زبان فارسی رہی جو اپنے لہجے اور زبان و بیان کے اعتبار سے "فارس" کے بجائے "وسطی ایشیا" کے زیادہ قریب تھی۔

سلاطین دہلی کے ۳۲۰ سالہ دور حکومت میں برصغیر پاکستان و ہند اور "وسطی ایشیا" کے درمیان علمی و ثقافتی روابط کے ساتھ سیاسی سطح پر بھی تعلقات استوار ہوئے۔ یہ روابط کبھی دشمنی اور کبھی دوستی کی مثال پیش کرتے تھے، مگر اتنا واضح ہے کہ "وسطی ایشیا" کے طاقتور حکمرانوں نے برصغیر کو کبھی نظر انداز نہیں کیا۔ یہ عجیب اتفاق ہے کہ ۱۲۰۶ء میں سلطنت دہلی کی باقاعدہ بنیاد پڑی اور اسی سال تموچن (۱۱۵۵ء - ۱۲۲۷ء) منگولوں کا "خان" بنا اور چنگیز کا لقب اختیار کیا جو بعد میں عظیم منگول سلطنت کا بانی ثابت ہوا۔

سلطنت دہلی کے سارے عرصے میں دریائے سندھ کے دونوں طرف کا علاقہ ٹکڑوں میں بٹا رہا اور یہاں کوئی پائیدار اور یکساں طرز حکومت جڑ نہ پکڑ سکا۔ "وسطی ایشیا" سے آنے والوں کا راستہ غزنی سے ہو کر گزرتا تھا اس لیے برصغیر میں اُن کی تاخت و تاراج کا میدان بنّوں اور اس سے ملحق علاقہ تھا۔ کوہ جُود (کوہستانِ نمک) اور اس کے گردو نواح کا خطّہ "وسطی ایشیا" اور سلطنت دہلی کے درمیان Buffer Zone کی حیثیت رکھتا تھا۔ "وسطی ایشیا" کے منگول حکمرانوں نے اپنی قوت میں اضافے کے لیے ہمیشہ برصغیر پر اپنی نظریں جمائے رکھیں مگر وہ اسے اپنی سلطنت کا حصہ بنانے کی جگہ اسے لوٹنے سے غرض رکھتے تھے۔ سلاطینِ دہلی کبھی اس پوزیشن میں نہیں تھے کہ وہ منگولوں کی قوت خود اُن کے وطن جا کر کچل دیتے، تمام لڑائیاں برصغیر کی سرزمین پر لڑی گئیں، تاہم سلاطین دہلی کے رویّے میں وقت کے ساتھ تبدیلی پیدا ہوئی۔ ابتداء میں دہلی کے سلاطین کی کوشش رہی کہ وہ منگولوں کے غصّے کو دعوت نہ دیں اور مصالحت کے ذریعے کام چلائیں۔ بعد میں اپنی سرحدوں کو مضبوط کرتے ہوئے سلاطینِ دہلی نے ان کے مقابلے کی پالیسی اختیار کی۔ درمیان میں "وسطی ایشیا" میں آنے والی تبدیلیوں نے منگول حکمرانوں کو کبھی دہلی پر حملہ آور ہونے اور کبھی تحائف اور نذرانوں سے لدے ہوئے سفیروں کو بھیجنے پر مجبور کیا۔[۶]

سلطنتِ دہلی اور "وسطی ایشیا" کے درمیان پہلا رابطہ چنگیز خان کی زندگی میں ہوا جب وہ جلال

© rasailojaraid.com

© rasailojaraid.com

الدین خوارزم شاہ کا تعاقب کرتے ہوئے دریائے سندھ تک آگیا تھا۔ خوارزم شاہ جان بچا کر لاہور پہنچا اور دہلی کے ارادے سے چل پڑا اُس نے "دینی اخوت" کے نام پر التتمش کو اپنے ساتھ ملا کر چنگیز خان کے خلاف متحدہ محاذ بنانے کی خواہش کا اظہار کیا۔ التتمش نے اپنی داخلی مشکلات اور راجپوت خطرے کے تحت یہی مناسب سمجھا کہ خوارزم شاہ کو دہلی آنے سے حکمت عملی سے روک دیا جائے اور چنگیز خان کی مخالفت مول نہ لی جائے۔ التتمش کی پالیسی کامیاب رہی۔ خوارزم شاہ، التتمش کے مخالف ناصر الدین قباچہ کے زیر انتظام علاقوں میں تاخت و تاراج کرتا رہا اور چنگیز خان واپس چلا گیا۔ چنگیز خان کے مقرر کردہ جرنیلوں نے خوارزم شاہ کا پیچھا جاری رکھا اور اس سلسلے میں توربی نامی منگول جرنیل نے ملتان پر حملہ کیا مگر پیش آمدہ مزاحمت کے تحت واپس غزنی چلا گیا۔

چنگیز خان کی وفات پر اُس کی عظیم سلطنت اُس کے چار بیٹوں (اور اُن کی اولاد) میں بٹ گئی۔ اوقتائی خان کو خانِ اعظم تسلیم کیا گیا (۱۲۲۹ء) اور مغربی منگولیا اُس کے زیر نگین تھا۔ کاشغر اور ماوراء النہر کے بڑے حصے یعنی "وسطی ایشیا" پر چغتائی خان کی حکومت تھی۔ جوجی کے اخلاف کو قبچاق کا علاقہ ملا اور چنگیز خان کے سب سے چھوٹے بیٹے تُلی کو منگولوں کا اصل وطن یعنی مشرقی منگولیا کا علاقہ ملا۔ ۱۲۴۱ء میں اوقتائی خان کے انتقال کے بعد چنگیز کی اولاد میں بالادستی کی جدوجہد شروع ہوئی اور ہلاکو خان ایران میں ایلخانی سلطنت قائم کرنے میں کامیاب ہوا۔

سلطنت دہلی کا تعلق "وسطی ایشیا" کے چغتائیوں اور ایران کے ایلخانیوں سے رہا۔ التتمش کی زندگی میں تو منگولوں نے برصغیر پر حملہ نہ کیا مگر التتمش کے کمزور جانشینوں نے منگولوں کو حملہ آور ہونے کے مواقع فراہم کیے۔ منگول رہنما بہادر تائر نے لاہور کا محاصرہ کیا اور ۳۱ دسمبر ۱۲۴۱ء کو اس اہم سرحدی شہر پر قبضہ کر لیا۔ چار سال بعد ملتان اور اوچ اُن کی ترک تازیوں کا نشانہ بنے۔ سلطان ناصر الدین محمود کے بھائی جلال الدین مسعود نے حصولِ اقتدار میں ناکامی کے بعد "وسطی ایشیا" کے منگو خان کے دربار میں پناہ حاصل کی۔ بعد میں اوچ اور ملتان کے معزول گورنر شیر خان نے بھی یہی راستہ اختیار کیا۔ منگو خان کے احکام پر منگول جرنیل سالی بہادر نے لاہور اور جالندھر پر قبضہ کر کے جلال الدین مسعود کو یہاں امیر بنا دیا۔ جلال الدین مسعود کے بعد کیخسرو نے کیقباد کے خلاف غزنی کے منگول گورنر سے مدد حاصل کرنے کی کوشش کی، اگرچہ وہ جلال الدین مسعود کی طرح کامیاب نہ ہو سکا تھا۔

ہلاکو خان نے سقوط بغداد (۱۲۵۸ء) کے بعد سلطنت دہلی کے ساتھ خوشگوار دوستانہ تعلقات استوار کیے اور اُس کی زندگی میں برصغیر پر کوئی حملہ نہ ہوا تاہم ہلاکو خان کے پوتے، عبداللہ خان نے ۱۲۹۲ء میں برصغیر پر حملہ کیا مگر جلد ہی دوستانہ روایت کی تجدید کر لی۔ جلال الدین خلجی (۱۲۹۰ء - ۱۲۹۶ء) اور اُس کے درمیان تحائف کا تبادلہ ہوا۔ ایک منگول سردار الغو خان سے جلال الدین خلجی کی ایک بیٹی بیاہی گئی، خان نے اسلام قبول کیا اور برصغیر کو اُس نے اپنا وطن بنا لیا تھا۔ خلجی دور میں ایران کے ایلخانیوں

© rasailojaraid.com

© rasailojaraid.com

کے تعلقات برصغیر سے دوستانہ رہے مگر "وسطی ایشیا" کے چغتائیوں نے یکے بعد دیگرے سات حملے کیے۔ تغلق عہد میں چغتائیوں کی پالیسی میں تبدیلی آئی۔ اولاً ۱۳۰۶ء میں دیوا کی وفات پر "وسطی ایشیا" عدم استحکام کا شکار ہو گیا تھا اور چغتائیوں کی باہمی لڑائیوں نے اُنھیں اتنا کمزور کر دیا تھا کہ اُن کے لیے بیرونی مہمات ممکن نہ تھیں۔ ثانیاً تغلق عہد کے معاصر چغتائی حکمرانوں نے اسلام قبول کر لیا تھا اور خصوصاً یہ اپنے ایلخانی بھائی بندوں کے بجائے تغلق حکمرانوں کے قریب تھے جو اُن کی طرح سُنی المسلک تھے۔ معاصر مؤرخین نے یہ بھی اطلاع دی ہے کہ سلطان محمد تغلق، ترما شرین اور مصر کے سلطان الناصر نے ایران کے شیعہ ایلخانی حاکم ابو سعید کے خلاف حملہ آور ہونے کی خاطر متحدہ محاذ بنا لیا تھا (۲۸-۱۳۲۷ء)، مگر اُن کا یہ مشترکہ حملہ ایلخانی حکومت کے خلاف اِس لیے نہ ہو سکا کہ "وسطی ایشیا" میں ترما شیرین کو اقتدار سے محروم ہونا پڑ گیا (۱۳۳۴ء)، نیز ابو سعید اور سلطان الناصر کے درمیان دوستی ہو گئی تھی۔ بدلے ہوئے حالات میں محمد بن تغلق نے بھی ابو سعید سے دوستانہ روابط استوار کر لیے۔ سلطان فیروز تغلق کے عہدِ حکومت میں منگولوں نے دیپال پور پر حملہ کیا مگر شکست کھا کر واپس ہوئے۔

اِس کے بعد "وسطی ایشیا" سے آنے والوں حملہ آوروں میں اہم ترین نام امیر تیمور کا ہے جس نے ۱۳۹۸ء میں دہلی کو تاراج کیا۔ تیمور سیّد خضر خان کو مفتوحہ علاقوں کا گورنر بناتے ہوئے سمرقند واپس چلا گیا۔ سیّد خضر خان امیر تیمور کی زندگی میں اپنے آپ کو اُس کا نائب سمجھتا رہا اور گاہے گاہے امیر تیمور کو تحائف بھیجتا رہا۔ تیمور کی وفات (۱۴۰۴ء) کے بعد اُس کے جانشین شاہ رخ مرزا سے سیّد خضر خان نے اپنی وفاداری کا اظہار کیا اور حسبِ معمول سیّد خضر خان کی سلطنت میں اُن کے نام کا خطبہ پڑھا جاتا رہا۔ سیّد مبارک شاہ نے اپنے والد (سیّد خضر خان) کی روایت پر عمل کرتے ہوئے تیموری حکمرانوں سے روابط قائم رکھے اور سیّد خاندان کے اِس اظہارِ اطاعت نے ظہیر الدین بابر کو یہ دعویٰ کرنے کا موقع فراہم کیا کہ برصغیر اُس کے اجداد کی راج دہانی ہے۔

برصغیر پاکستان و ہند میں سلطنت دہلی کی جگہ مغل بادشاہت کے قیام سے ایک نئے دور کا آغاز ہوا۔ بابر خود "وسطی ایشیا" سے تعلق رکھتا تھا اور اُسے قیامِ برصغیر کے چار پانچ برسوں میں سمرقند کی یاد ستاتی رہی تھی۔ مغل سلطنت میں پنجاب اور موجودہ افغانستان کے وہ علاقے شامل تھے جو سلطنت دہلی کے دور میں یا تو Buffer Zone کی حیثیت رکھتے تھے یا "وسطی ایشیا" کے حکمرانوں کے زیرِ نگین تھے۔ بابر کو حکومت کے چار سال ملے اور اِس کے جانشین نصیر الدین ہمایوں کو دس سال بعد تخت چھوڑ کر ایران کی خاک چھاننی پڑی - جب پندرہ سال بعد اُسے ایرانی امداد و تعاون کے ساتھ دوبارہ تخت حاصل ہوا تو ایک ٹھوکر نے اُس کی زندگی کا چراغ گل کر دیا۔ مغل بادشاہت کا حقیقی جلال و جبروت جلال الدین اکبر اور اِس جانشینوں کے ذریعے قائم ہوا۔

© rasailojaraid.com

© rasailojaraid.com

بابر کے زمانے سے "وسطی ایشیا" پر شیبانی حکمرانی کر رہے تھے اور ایک حد تک مغل بادشاہت کے مخالف ہمسائے تھے مگر دونوں بادشاہتوں کے حکمران اپنے اپنے مسائل میں الجھے رہے۔ شاہجہاں کے عہد میں بخارا اور سمرقند پر امام قلی کی حکومت تھی اور بلخ و بدخشاں پر اُس کا چھوٹا بھائی نذر محمد حاکم تھا۔ ۱۶۲۹ء میں نذر محمد نے کابل پر حملہ کیا اور اس کے ایک اہم درّے بامیان پر قبضہ کر لیا لیکن شاہجہاں کی فوجی قوت سے آگاہ ہونے پر اپنی غلطی کا احساس کرتے ہوئے اس نے معافی مانگ کر فوجیں پیچھے ہٹا لیں۔ اس طرح جو کدورت اور عداوت پیدا ہوئی تھی، ختم ہو گئی۔ ۱۶۴۲ء میں امام قلی کی بینائی جاتی رہی تو نذر محمد نے بخارا اور سمرقند پر بھی قبضہ کر لیا۔ نذر محمد ایک غیر مقبول حکمران ثابت ہوا۔ عوام نے بغاوت کرتے ہوئے اُس کے بیٹے عبدالعزیز کو اپنا بادشاہ بنا لیا تو نذر محمد اور عبدالعزیز یعنی باپ بیٹے کے درمیان اقتدار کی کشمکش شروع ہو گئی۔ نذر محمد نے شاہجہاں سے فوجی امداد کی درخواست کی۔ شاہجہاں کو اپنے اجداد کی سرزمین میں اثر و رسوخ بڑھانے کا خداداد موقع مل رہا تھا، چنانچہ اُس نے بظاہر نذر محمد کی امداد اور حقیقتاً اپنے اجداد کی راج دہانی میں اثر و رسوخ پیدا کرنے کے لیے شہزادہ مراد کی سرکردگی میں مغل فوج روانہ کر دی۔ (۱۶۴۶ء)

مغل فوج نے ابتداءً نذر محمد کی امداد کی لیکن بعد ازاں اُسے شکست دے کر بخارا و سمرقند پر قبضہ کرنے کا منصوبہ بنا لیا۔ بلخ اور بدخشاں پر مغل فوج قابض ہو گئی اور نذر محمد بھاگ کر ایران چلا گیا۔ ایران کے معاصر صفوی حکمران (شاہ عباس) نے شاہجہاں کے خلاف، نذر محمد کی امداد کا اعلان کر دیا۔ شہزادہ مراد جنگ سے اُکتا کر واپس آ گیا اور ازبکوں نے مغل فوج کو قزاقانہ طریقِ جنگ اختیار کرتے ہوئے خوب تنگ کیا چنانچہ ۱۶۴۷ء میں اورنگ زیب کی نگرانی میں دوسری مہم روانہ کی گئی۔ اورنگ زیب نے عبدالعزیز شاہ بخارا کو شکست دی۔[۸] جب دونوں باپ بیٹا اپنے اپنے مقاصد میں ناکام ہو گئے تو باپ نذر محمد نے شاہجہاں سے درخواست کی کہ بدخشاں اسے واپس کر دیا جائے، دریں اثنا شاہجہاں اور اُس کے جرنیلوں کو بھی یہ احساس ہو گیا تھا کہ "وسطی ایشیا" کی فتح اور اس پر قبضہ قائم رکھنا خسارے کا سودا ہے، چنانچہ نذر محمد کی درخواست پر نہ صرف بدخشاں اُسے دے دیا گیا بلکہ دوسرے مفتوحہ علاقے بھی اُس کی جھولی میں ڈال دیے گئے۔ "وسطی ایشیا" کی مہم میں جانی و مالی نقصان نے مغل بادشاہوں پر واضح کر دیا کہ "وسطی ایشیا" میں قسمت آزمائی کی چنداں ضرورت نہیں۔ اورنگ زیب عالمگیر نے ۵۱ سالہ دورِ حکومت میں جنوبی ہند پر توجہ دی اور اس کی رحلت کے بعد مغلوں کا دورِ زوال شروع ہو گیا تھا جس میں اپنی حفاظت کرنا اُن کے لیے مسئلہ تھا، چہ جائیکہ "وسطی ایشیا" کے لیے کوئی مہم روانہ کی جاتی۔

مغل بادشاہت میں "وسطی ایشیا" سے سیاسی روابط میں حکمرانوں کو چنداں کامیابی نہیں ہوئی مگر ثقافتی و علمی سطح پر روابط میں کوئی کمی بھی نہ آئی۔ ملا عبدالقادر بدایونی نے اکبر کے ابتدائی چالیس سالہ عہدِ حکمرانی کے واقعات "منتخب التواریخ" میں لکھے ہیں جس کا تیسرا حصہ اکبری دور کے مشائخ و علماء اور

© rasailojaraid.com

© rasailojaraid.com

حکماء و شعراء کے احوال و آثار کے تعارف کے لیے وقف ہے۔ اس پر ایک نظر ڈالنے سے معلوم ہوتا ہے کہ مقامی اہل علم و دانش کے ساتھ بہت سے لوگ "وسطی ایشیا" سے یہاں آئے اور نام کمایا۔ خواجہ عبیداللہ احرار کے پوتے خواجہ عبدالشہید کے بارے میں لکھا گیا ہے کہ[9]

> سمرقند سے ہندوستان آکر یہاں اٹھارہ سال بسر کیے۔ ۹۸۲ھ ف ۷۵-۱۵۷۴ء میں فرمایا کرتے تھے، ہماری رحلت کا وقت قریب آچکا ہے اور یہ ہمارے لیے لازمی ہے کہ ہم اپنی ہڈیوں کو سمرقند میں اپنے آبائی قبرستان میں پہنچا دیں۔ خواجہ صاحب کے سمرقند پہنچنے کے دو تین دن بعد اس دنیا سے رخصت ہوگئے۔

شیخ یعقوب صرفی عہد ہمایونی و اکبری کے بلند پایہ عالم، صوفی اور شاعر تھے۔ انہوں نے اپنے مرشد شیخ حسین خوارزمی سے ملاقات کے لیے "وسطی ایشیا" کا سفر اختیار کیا۔ "وسطی ایشیا" اور مشرقِ وسطیٰ کی اپنی سیاحت کے بارے میں انہوں نے "مغازی النبی" کے آغاز میں مفید معلومات فراہم کی ہیں۔[10] اِسی طرح عہد اکبری کے مولانا سعید ترکستانی، حافظ تاشقندی، قاضی نظام بدخشی، ملا پیر محمد شروانی، مرزا مُفلس ازبک جیسے اہل علم کا تعلق "وسطی ایشیا" سے تھا۔ شعراء اور علماء کے ساتھ بیسیوں سپاہی پیشہ "وسطی ایشیا" سے آکر یہاں اعلیٰ عہدوں پر فائز رہے۔

جہاں تک تجارتی روابط کا تعلق ہے، "وسطی ایشیا" کا سامان برصغیر پاکستان و ہند کے بازاروں میں بکتا تھا۔ "وسطی ایشیا" میں شیبانیوں کے بعد استرخانی برسراقتدار آئے اور ان کے دور (۱۵۹۷ء-۱۶۸۰ء) میں "وسطی ایشیا" خیوا، بخارا، فرغانہ اور قازق کی آزاد و خود مختار ریاستوں میں بٹ گیا۔ یہ حکمران عہد زوال کے حکمرانوں کی طرح باہم برسرِپیکار رہے اور ان کے مشترکہ حریف اُن پر تسلط حاصل کرنے کے لیے کوشاں رہے۔ اسی زمانے میں برصغیر کی مغل بادشاہت کمزور سے کمزور تر ہوتی جارہی تھی اور ایسٹ انڈیا کمپنی کے اثر و رسوخ میں بتدریج اضافہ ہوتا جارہا تھا۔

© rasailojaraid.com

© rasailojaraid.com

ایسٹ انڈیا کمپنی کے اقتدار کا آغاز برصغیر پاکستان و ہند کے مشرق یعنی بنگال سے ہوا اور بتدریج مغرب کی طرف پھیلتا گیا۔ انیسویں صدی کے نصف اوّل میں برطانوی اختیار و اقتدار دریائے سندھ تک پہنچ گیا۔ اس کے ساتھ ہی بین الاقوامی سطح پر برطانوی قوت میں بے پناہ اضافہ ہوا۔ دوسری استعماری طاقتوں کے اس کی عداوت و مخالفت فطری تھی۔

یورپی سیاست میں نپولین بونا پارٹ (۱۷۶۹ء - ۱۸۲۱ء) برطانیہ کو زک پہنچانے کی فکر میں تھا۔ ۱۸۰۱ء میں اس نے زار روس پال اوّل کے ساتھ مل کر برصغیر پاکستان و ہند در آنے کا پروگرام بنایا۔ منصوبے کے مطابق فرانس اور روس کی مشترکہ فوجیں استرخان میں جمع ہوتیں اور ایران کے تعاون سے ہرات اور قندھار کے راستے درۂ بولان پہنچتیں اور برصغیر پاکستان و ہند میں داخل ہو جاتیں، مگر اس سے پہلے کہ افواج باقاعدہ نقل و حرکت کرتیں، زارِ روس کی موت نے اس منصوبے کو خاک میں ملا دیا۔

یورپ میں نپولین کے زوال پر برطانیہ کو یہ حیثیت حاصل ہو گئی تھی کہ اسے کوئی چیلنج کرنے والا نہ تھا۔ بحیرۂ روم اور بحر ہند پر اس کا مکمل تسلط تھا، اور وہ مشرق میں من مانی کرنے کی پوزیشن میں تھا۔ روس کے لیے یہ سب کچھ برداشت کیے بغیر کوئی چارہ نہ تھا بلکہ اسے اس بات کا شدید خطرہ محسوس ہو رہا تھا کہ برطانوی اقتدار افغانستان کے راستے وسطی ایشیا تک آ سکتا ہے۔ وسطی ایشیا میں روس کے اہم تجارتی مفادات تھے۔

اس کے برعکس برطانوی پالیسی سازوں کو نظر آ رہا تھا کہ روس جنوب کی طرف بتدریج بڑھ رہا ہے۔ خیوا، بخارا، خوقند اور قازق میدانوں پر اس کی نظر ہے اور اگر روس واقعی آگے بڑھتا ہے تو اس کا راستہ روکنے کی کیا سبیل ہو گی؟ کیا خیوا اور بخارا کے "خان" روس کے ریچھ کو روکنے کی پوزیشن میں ہیں؟ کیا ان کے ساتھ تعاون ہو سکتا ہے؟ اور اگر کبھی ایسٹ انڈیا کمپنی کو اپنے مفادات کے تحفظ کوئی اقدام کرنا پڑتا ہے تو صورتِ حال کیا ہو گی؟

اس پس منظر میں برطانوی ہند کے پالیسی سازوں نے ایلچیوں اور جاسوسوں کے ذریعے افغانستان اور وسطی ایشیا کے بارے میں معلومات اکٹھی کرنی شروع کیں۔ ان بظاہر سیاحوں اور بباطن جاسوسوں نے نہ صرف اپنی خفیہ رپورٹوں میں وسطی ایشیا کے مسلمان حکمرانوں کے ساتھ تعلقات کے قیام اور استحکام پر رائے دی بلکہ ان کی فوجی قوت کے جائزے پیش کیے۔ فوجی اہمیت کی حامل جگہوں اور خطّے کی جغرافیائی ساخت پر نقشے مرتب کیے۔ ان میں چند ایک نے اپنے ذوقِ تالیف کی تسکین کے لیے سفری یادداشتیں اور تاثرات لکھے ہیں۔ برطانوی نژاد سیاحوں اور ایلچیوں کے ساتھ محکمۂ تعلیم کے منشیوں اور پنڈتوں، نیز آثارِ قدیمہ کے ماہرین سے بھی خوب خوب استفادہ کیا گیا۔ ایلچیوں اور سیاحوں کا یہ آنا جانا یکطرفہ نہ تھا۔ روس کے زار بھی افغانستان اور پنجاب میں اپنے نمائندوں کے ذریعے حالات سے باخبر

© rasailojaraid.com

© rasailojaraid.com

رہتے تھے۔

۱۸۵۷ء میں ناکام جنگ آزادی کے بعد شمالی ہند پر مکمل برطانوی قبضہ ہو گیا اور کمپنی کی جگہ تاجِ برطانیہ نے پالیسی سازی سنبھال لی۔ ۱۸۵۷ء کے بعد برطانوی پالیسی یہ رہی کہ روس افغانستان کے معاملات میں مداخلت نہ کرے اور وسطی ایشیا میں اس کی طرف سے کوئی ایسی مداخلت نہ ہو جس سے زار شاہی کو شکایت پیدا ہو۔

روس - برطانیہ تعلقات کی سرد مہری کے باوجود وسطی ایشیا اور برصغیر پاکستان و ہند کے درمیان تجارتی و ثقافتی روابط حسبِ سابق قائم رہے۔ مولانا مناظر احسن گیلانی نے برکات احمد ٹونکی کے بارے میں لکھا ہے کہ "

> وسطِ ایشیا، ترکستان کے شہروں خصوصاً بخارا، تاشقند وغیرہ سے شروع کر کے بنگال کے آخری حدود تک چلے جاؤ۔ تقریباً ہر بڑے شہر میں آپ کا کوئی نہ کوئی شاگرد ضرور نظر آئے گا گا آپ خصوصیت کے ساتھ ابنِ سینا، طوسی، قوشجی، دوّانی، خوانساری، میر باقر داماد کی کتابیں پڑھاتے تھے جو اس زمانہ میں صرف ہندوستان ہی میں نہیں بلکہ شاید دنیائے اسلام میں بھی نہیں پڑھائی جاتی تھیں اور ماوراء النہر کے طلبہ میں ان مصنّفین کی کتابوں کے پڑھنے کا خاص ذوق تھا۔

حواشی

۱۔ تاریخ سلاطین آل غزنین بحوالہ شیخ محمد اکرام، آبِ کوثر، لاہور: فیروز سنز لمٹیڈ (۱۹۷۱ء)، ص ۶۵

۲۔ محمد بن عبدالکریم شہرستانی، [Muslim Sects and Divisions "کتاب الملل والنحل" کے ایک حصہ کا ترجمہ جو مسلم فرقوں سے متعلق ہے۔ از "اے - کے - قاضی" اور "جے - جی - فلائن"]، لندن: کیگن پال انٹر نیشنل (۱۹۸۴ء)، ص ۱۶۵

۳۔ شبیر احمد، قرونِ وسطیٰ کے ہندوستان میں فلسفہ و حکمت کا آغاز و ارتقاء، اقبال ریویو (کراچی)، جنوری ۱۹۶۷ء، ص ۶۰ - ۶۱

بو علی سینا کے اسماعیلی ربط کے لیے دیکھیے، اُس کی خود نوشت "سیرۃ الشیخ الرئیس" (عربی)۔ اصل متن اور اس کے انگریزی ترجمے کے لیے دیکھیے: ولیم - ای - گوہلمین، The Life of Ibn Sina: A Critical Edition and Annotated Translation، نیو یارک: اسٹیٹ یونیورسٹی آف نیو یارک پریس (۱۹۷۴ء)، ص ۱۸ - ۱۹، نیز ص ۱۲۰

۴۔ تفصیلی بحث کے لیے دیکھیے: محمد ایوب قادری، حضرت مخدوم جہانیاں جہاں گشت، کراچی: ایچ - ایم

© rasailojaraid.com

© rasailojaraid.com

- سعید کمپنی (۱۹۷۵ء)، ص ۸۲-۸۸

۵۔ بحوالہ خلیق احمد نظامی، تاریخ مشائخ چشت، اسلام آباد: دارالمؤلفین (س-ن)، ص ۱۳۱

۶۔ "وسطی ایشیا" سے متعلق سلاطینِ دہلی کی پالیسی کے لیے دیکھیے: آغا حسین ہمدانی، The Frontier Policy of the Delhi Sultans، اسلام آباد: قومی ادارہ برائے تحقیقِ تاریخ و ثقافت (۱۹۸۶ء)، یار محمد خان، Studies in the History of Indo - Pakistan Subcontinent، لاہور: ریسرچ سوسائٹی آف پاکستان (۱۹۹۱ء)، ص ۷۳-۱۰۵

۷۔ ظہیر الدین محمد بابر کی خود نوشت "توزک بابری" میں سمرقند کا ذکر دیکھیے۔ ایک موقع پر بابر نے لکھا ہے کہ "تمام عالم میں سمرقند کے برابر کوئی شہر لطیف نہ ہوگا۔" بابر نامہ (ترجمہ: مرزا نصیر الدین حیدر)، کراچی: بک لینڈ (۱۹۶۲ء)، ص ۷۳

۸۔ تفصیلات کے لیے دیکھیے: سید معین الحق، Prince Awrangzib: A Study، کراچی: پاکستان ہسٹاریکل سوسائٹی (۱۹۶۲ء)، ص ۱۸-۲۴

۹۔ ملّا عبدالقادر بدایونی، منتخب التواریخ (ترجمہ)، لاہور: شیخ غلام علی اینڈ سنز (۱۹۶۲ء)، ص ۵۸۲ - ۵۸۳

۱۰۔ دیکھیے: محمد عبداللہ قریشی، شیخ یعقوب صرفی، ماہنامہ ادبی دنیا (لاہور)، کشمیر نمبر (مارچ - اپریل ۱۹۶۶ء)، ص ۳۱۵ - ۳۳۱، نیز غلام رسول خان، شیخ یعقوب صرفی کا دورۂ ایران و وسطِ ایشیا، دانش (اسلام آباد)، فروری ۱۹۹۳ء، ص ۲۱۱-۲۳۱

۱۱۔ مناظر احسن گیلانی، مقالہ "برکات احمد ٹونکی"، معارف (اعظم گڑھ)، ص ۳۳۲

© rasailojaraid.com

© rasailojaraid.com

چنگیز خان اور امیر تیمور گورگان اور اُن کے قریبی اخلاف کا جو تعلق برصغیر کی سیاست سے تھا، یہ مؤرخین کی توجہ حاصل کرنے کے لیے کافی تھا۔ اس پر مستزاد ان دونوں "حملہ آوروں" سے مغل بادشاہت کے بانی ظہیرالدین محمد بابر (م ۱۵۳۰ء) کا نسبی تعلق تھا۔ وہ باپ کی جانب سے امیر تیمور گورگان کی اولاد میں سے تھا اور ماں کی طرف سے اُس کا سلسلۂ نسب چنگیز خان سے ملتا تھا۔ بابر کے حوالے سے بھی مؤرخین نے چنگیز خان اور تیمور کو اپنی تحقیقات کا موضوع بنایا ہے۔

چنگیز خان کے حوالے سے عبداللہ بن فضل اللہ شیرازی کی تاریخ "تجزیتہ الامصار و تزجیتہ الاعصار" معروف بہ تاریخِ وصاف کو بہت اہمیت حاصل ہے۔ یہ تاریخ ۶۹۹ھ اور ۷۱۲ھ کے درمیان لکھی گئی تھی اور نظم و نثر کے صنائع لفظی و معنوی کے اعتبار سے نمایاں ہے۔ فارسی انشاء پردازی کے ایک نمونے کی حیثیت سے اس کے منتخب حصے پنجاب یونیورسٹی کے نصاب "منشی فاضل" میں شامل رہے ہیں۔ اس کی جلد اوّل (تا اختتام عہد ارغون خان) شیخ محمد اقبال استاد اورینٹل کالج لاہور نے غیر ضروری عبارتوں اور اشعار حذف کرتے ہوئے مرتب کی تھی۔ نصابی کتاب ہونے کی حیثیت سے اس کی شرحیں، ترجمے اور فرہنگ تیار کیے گئے ہیں جن میں سیّد اولاد حسین شاداں بلگرامی کی "فرہنگِ تاریخِ وصاف" کو طلبہ کے حلقوں میں پذیرائی حاصل رہی ہے۔

چنگیز خان پر مستقل بالذات کتابوں کے علاوہ امریکی مصنف ہیرلڈلیم کی تالیفات "چنگیز خان" اور "March of the Barbarians" کے تراجم کو مقبولیت حاصل رہی ہے۔ اُردو کے بلند پایہ مترجمین نے انہیں اُردو کا جامہ بتایا ہے۔ مولوی محمد عنایت اللہ، پروفیسر عزیز احمد اور بریگیڈیر گلزار احمد نے "چنگیز خان" کے الگ الگ تراجم کیے ہیں۔

امیر تیمور گورگان کے حوالے سے سب سے پہلے "تزک تیموری" یا "ملفوظاتِ صاحبقرانی" کا ذکر آنا چاہیے جسے امیر تیمور کی خود نوشت کی حیثیت سے بعض اہلِ قلم نے بہت اہمیت دی ہے، اگرچہ امیر تیمور کی جانب اس کا انتساب مشکوک ہے۔[۱] "ملفوظاتِ تیموری" کے اُردو میں ایک سے زیادہ ترجمے ہوئے اور لوگوں نے امیر تیمور کے بارے میں اس کتاب سے اپنی رائے قائم کی۔

امیر تیمور کی سوانح حیات اور عہد پر جو متعدد کتابیں لکھی گئیں، ان میں نظام الدین شامی، شرف الدین یزدی اور عبداللہ ہاتفی کے "ظفر ناموں" کو بنیادی اہمیت حاصل ہے۔ نظام الدین شامی نے خود امیر تیمور کی فرمائش پر ۱۴۰۱ء اور ۱۴۰۴ء کے درمیان تیمور کے حینِ حیات "ظفر نامہ" مکمل کیا۔ ایک دوسرے مؤرخ حافظ ابرو نے ۱۴۲۵ء میں "ظفر نامۂ شامی" کا ذیل مرتب کیا اور پھر شاہ رخ مرزا (م

© rasailojaraid.com

© rasailojaraid.com

۱۴۴۷ء) کے حکم سے تاج سلمانی نے "ذیل ظفر نامہ" کے نام سے شامی کی تالیف میں ۱۴۰۴ء سے ۱۴۱۰ء تک کے حالات شامل کیے۔

تیموری حکمران ابراہیم سلطان نے سرکاری کاغذات اور عینی شاہدوں کے بیانات، نیز پہلے سے لکھی گئی کتابوں کی مدد سے امیر تیمور کے حالات اور فتوحات پر تاریخ مرتب کی جسے شرف الدین علی یزدی نے اپنے خاص ادبی سلیقے سے ازسرنو لکھا اور "فتح نامۂ تیموری" کا نام دیا، تاہم نظام الدین شامی کے "ظفر نامہ" کو اتنی مقبولیت حاصل ہوچکی تھی کہ شرف الدین یزدی کی کتاب بھی "فتح نامۂ تیموری" کے بجائے "ظفر نامہ" کے نام سے ہی مقبول ہوئی۔[۲]

ظفر نامہ تیموری (یزدی) پر انحصار کرتے ہوئے مولانا عبدالرحمٰن جامی کے بھانجے عبداللہ ہاتفی نے (م ۱۵۲۱ء) تیمور کی فتوحات اور سیاسی کارناموں کو نظم کیا ہے جو "تیمور نامۂ ہاتفی"، یا "ظفر نامہ ہاتفی" کے نام سے معروف ہے۔

ان "ظفر ناموں" میں سب سے زیادہ مقبولیت "ظفر نامۂ یزدی" کو حاصل ہوئی ہے۔ بعد کے مورخین نے، جن میں "روضتہ الصفا" اور "حبیب السیر" کے مصنف بالخصوص قابلِ ذکر ہیں، تیمور کے عہد پر لکھتے ہوئے اس پر انحصار کیا ہے بلکہ اکثر اس کی عبارتیں حذف واختصار یا تبدیلی الفاظ کے ساتھ اپنی کتابوں میں درج کی ہیں۔[۳] "ظفر نامہ" نے تاریخ نگاری کا جو نمونہ پیش کیا، بعد کے آنے والوں نے ایران اور برصغیر پاکستان وہند میں اس کے تتبع کی کوشش کی۔

ظفر نامۂ یزدی اپنے موضوع کے لحاظ سے امیر تیمور اور اُس کے جانشینوں کی تاریخ ہے مگر حقیقتاً یہ اس دور کی ایسی عمرانیاتی دائرۃ المعارف ہے کہ اُس دور کے ہر طبقے کی زندگی اور معاشرت پوری جزئیات کے ساتھ محفوظ ہو گئی ہے۔ ظفر نامہ وسطی ایشیا (افغانستان، ماوراء النہر، ایران، گرجستان، ارمنستان، قفقاز)، برصغیر پاکستان وہند اور ایشیائے کوچک کی سیاسی اور حکومتی تشکیلات کے بارے میں بنیادی اور اہم اطلاعات فراہم کرتا ہے۔

برصغیر کے مغل حکمرانوں کو "ظفر نامہ" سے بڑی دلچسپی رہی ہے۔ بابر کے خوش طبع دوست (اور ایک روایت کے مطابق سیکرٹری) زین الدین خوافی (م ۱۵۳۴ء) نے بابر کے حملۂ ہند (۱۵۲۶ء) کے ذکر میں لکھا ہے کہ اُس موقع پر بابر کے سپاہیوں میں سے بعض نے "ظفر نامہ" کا مطالعہ کیا تاکہ برصغیر کے جغرافیائی حالات سے آگاہ ہوں۔ اس موقع پر خوافی نے ظفر نامہ کے حوالے سے برصغیر کے حالات بیان کیے ہیں اور اپنے دور کے مشاہدات کے ساتھ ان کا تقابل کیا ہے۔[۴] جہانگیر نے عبدالستار بن قاسم لاہوری سے "ظفر نامہ" کی تلخیص تیار کرائی تھی۔ اسی طرح شاہجہان نے بھی "ظفر نامہ" سے دلچسپی لیتے ہوئے اس کا ایک خلاصہ مرتب کرایا۔

برطانوی دور میں "ظفر نامہ" کو مولوی محمد اللہ داد نے ایشیاٹک سوسائٹی آف بنگال (کلکتہ) کی

© rasailojaraid.com

© rasailojaraid.com

Bibliotheca Indica سیریز کے تحت مرتّب کیا جو سوسائٹی کی جانب سے دو جلدوں میں ۱۸۸۷ء اور ۱۸۸۸ء میں شائع ہوا۔ "ظفر نامہ" کی اشاعت سے دلچسپی میں مزید اضافہ ہوا۔ ظفر نامہ کے کلکتہ ایڈیشن میں کوئی اشاریہ شامل نہیں تھا۔ مولوی محمد شفیع (پرنسپل اورینٹل کالج لاہور) نے اپنی ضرورت کے تحت اِس کی پہلی جلد میں مذکور اشخاص اور اماکن کا اشاریہ تیار کیا اور دونوں جلدوں کے مضامین کی ایک فہرست / اشاریہ مرتب کی۔ وہ "ظفر نامہ" پر مزید کام کرنا چاہتے تھے جس کا اظہار اُن کی یادداشتوں سے ہوتا ہے۔ اُن کی رحلت کے بعد یہ یادداشتیں پروفیسر سیّد وزیر الحسن عابدی نے مرتب کردی تھیں۔

تیموری عہد کی دوسری مبسوط تاریخ کمال الدین عبدالرزاق سمرقندی (م ۱۴۸۲ء) کی "مطلع السعدین و مجمع البحرین" ہے جو دو دفاتر (حصوں) میں منقسم ہے۔ دفتر اوّل میں "از زائش سلطان ابو سعید ایلخانی -- تا ذکر وفات صاحبقران تیمور" ہے۔ دفتر دوم "فرمانروائی شاہ رخ تا پایان فرمانروائی ابوالغازی سلطان حسین و سال ۸۷۵ھ --" پر حاوی ہے۔ مولوی محمد شفیع نے "مطلع السعدین" کے دفتر دوم کا ابتدائی حصہ ۱۹۴۱ء میں اور آخری حصہ ۱۹۴۹ء میں مرتب کیا۔ (کل صفحات ۱۵۵۸) "مطلع السعدین" کے منتخب حصے منشی فاضل کے نصاب میں شامل کیے گئے اور طلبہ کی ضروریات کے لیے ان کے ترجمے اور فرہنگ مرتّب ہوتے رہے۔

مولوی محمد شفیع کی "مطالعۂ تیمور" کی روایت کو ڈاکٹر سیّد عبداللہ نے آگے بڑھایا اور تیموری سلاطین کے عہد کی فارسی شاعری پر وقیع مقالات لکھے۔

"ظفر نامۂ یزدی" کی کلکتہ، تہران اور تاشکند کی اشاعتوں کے بعد مدراس یونیورسٹی کے صدر شعبۂ عربی و فارسی مولانا ابوہاشم محمد یُوشع نے عبداللہ ہاتفی کا "ظفر نامہ" مرتب کیا جو یونیورسٹی کے شعبۂ مشرقیات کی جانب سے ۱۹۵۹ء میں شائع ہوا۔

امیر تیمور کے حوالے سے بنیادی ماخذوں کی اشاعت کے ساتھ امیر تیمور متعدّد مؤرخین کی توجہ کا مرکز رہا ہے۔ مولانا اکبر شاہ خان نجیب آبادی (م ۱۹۳۸ء) نے تین جلدوں میں "تاریخ اسلام" لکھی تو "وسطی ایشیا" کے حکمرانوں کے لیے کچھ صفحات مختص کیے۔ انھوں نے امیر تیمور اور سلطان بایزید یلدرم کی معرکہ آرائی پر ایک کتابچہ "جنگِ انگورہ" لکھا جو ۱۹۳۱ء میں الگ سے شائع ہوا تھا۔

ماضی قریب میں حقیقت و افسانہ کے امتزاج پر مبنی ہیرلڈلیم کی تالیف Tamerlane کو بہت پڑھا گیا ہے۔ اس کا اوّلین ترجمہ مولوی محمد عنایت اللہ نے ۱۹۳۰ء میں کیا تھا۔ بعد میں پروفیسر عزیز احمد نے ایک نیا ترجمہ کیا اور ۱۹۵۶ء میں بریگیڈیر گلزار احمد کے قلم سے اِس کا تیسرا ترجمہ شائع ہوا۔ امیر تیمور کے حوالے سے برصغیر کے فنِ تعمیر اور مصوری پر ڈاکٹر عبداللہ چغتائی اور اُن کے برادر

© rasailojaraid.com

© rasailojaraid.com

عبدالرحمٰن چغتائی نے اُردو اور انگریزی میں چند مقالات لکھے ہیں۔

جسم و جہان کے "فاتحین" کے حوالے سے جہاں چنگیز خان، امیر تیمور اور ان کی اولاد مطالعہ و تحقیق کا موضوع رہی ہے، وہیں فکر و ذہن کے فاتحین میں صوفیاء و علماء اور اہل شعر و ادب کو نظر انداز نہیں کیا گیا۔ گزشتہ صفحات میں وسطی ایشیا سے آنے والے صوفیاء اور علماء کی جانب اشارہ کیا جا چکا ہے۔ سلسلۂ خواجگان یا سلسلۂ نقشبندیہ کی اشاعت میں خواجہ باقی باللہ نے بطور صوفی حصہ لیا مگر اُن سے پہلے مغل بادشاہ ظہیرالدین محمد بابر اس سلسلے کی تعلیمات سے اعتناء کر چکا تھا۔ بابر نے خواجہ عبیداللہ احرار کے رسالہ "والدیہ" (فارسی) کو ترکی میں نظم کیا تھا۔[5] خواجہ عبیداللہ احرار کی اولاد میں سے متعدد افراد برصغیر پاکستان و ہند میں وارد ہوئے۔ اُن کے ایک پوتے خواجہ عبدالحق (بن خواجہ محمد عبداللہ) بابر کی ملازمت میں تھے۔ دونوں کے درمیان مراسلت رہتی تھی۔ مرزا کامران (فرزند بابر) خواجہ عبدالحق کا مرید تھا۔[6] اس خانوادے کے ایک بزرگ امیر ابوالعلاء نقشبندی (م ۱۶۵۱ء)[7] تھے جو سلسلہ ابوالعلائیہ نقشبندیہ کے بانی ہیں۔ برصغیر پاکستان و ہند کے تیموری حکمرانوں میں نقشبندی سلسلے کی مقبولیت کا شاید ایک سبب یہ "تیموری" روایت بھی ہے۔

خواجہ باقی باللہ کے مرید و خلیفہ حضرت مجدد الف ثانی تھے۔ اُن سے نہ صرف نقشبندی سلسلے کو برصغیر میں فروغ حاصل ہوا بلکہ مجددی بزرگوں کی مساعی نے افغانستان میں بھی مقبولیت حاصل کی۔ کابل کے ملا شور بازار خاندان کا ذکر کیا جا چکا ہے۔ افغانستان کے شمال مشرق کے علاقے کے نہری نظام کے بارے میں انیسویں صدی کے آغاز میں سید عزت اللہ نے "تاریخ منازل بخارا" میں نقل کیا تھا کہ یہاں کی ایک نہر کا محصول/آبیانہ شاہ افغانستان کی طرف سے سرہند کی خانقاہ و مزار کے لیے وقف تھا۔[8]

نقشبندی صوفیاء — خواجہ عبدالخالق غجدوانی، خواجہ عزیزان رامیتنی، خواجہ عبیداللہ احرار، خواجہ محمد پارسا اور شیخ یعقوب چرخی وغیرہ کی تالیفات برصغیر کے ہر اچھے کتب خانے میں محفوظ ہیں۔[9] برصغیر کے نقشبندی اہل طریقت نے نقشبندی سلسلے کے لٹریچر کی اشاعت میں حصہ لیا ہے۔ وسطی ایشیا کے نقشبندی بزرگوں کی تعلیمات عام کی گئی ہیں۔ نقشبندی متون کی ترتیب و تدوین اور ترجمہ و تلخیص کی روایت مسلسل چلی آرہی ہے۔ گزشتہ پچیس تیس برسوں میں ڈاکٹر غلام مصطفیٰ خان (حیدرآباد - سندھ)، ملک محمد اقبال اور محمد نذیر رانجھا نے وسطی ایشیا کے ان نقشبندی بزرگوں کی کئی تالیفات جدید ترتیب و تدوین کے ساتھ شائع کی ہیں۔ سید امیر کلال (م ۱۳۷۰ء) خواجہ بہاءالدین نقشبند کے مرشد گرامی تھے۔ اُن کے احوال میں ایک رسالہ "آگاہی سید امیر کلال" کے نام سے ملتا ہے۔ پہلی بار ڈاکٹر غلام مصطفیٰ خان کی ترتیب و تدوین کے ساتھ شائع ہوا۔ [کراچی: مکتبہ اعلیٰ (۱۹۶۱ء)] اسی طرح انہوں نے سات رسائل کا ایک مجموعہ "رسائل مشاہیر نقشبندیہ" [حیدرآباد (سندھ): حاجی محبوب الٰہی

© rasailojaraid.com

© rasailojaraid.com

(۱۹۵۸ء)] مرتب کیا جس میں خواجہ عزیزان رامیتنی کا رسالہ شریفہ، خواجہ محمد پارسا کا رسالہ قدسیہ، مولانا یعقوب چرخی کا رسالہ اُنسیہ اور خواجہ عبید اللہ کا رسالہ انفاس نفیسہ شامل ہیں۔

رسالہ قدسیہ کی ایک اشاعت ملک محمد اقبال (راولپنڈی) کی کاوش سے منصۂ شہود پر آئی۔ [راولپنڈی: مرکز تحقیقات فارسی ایران و پاکستان (۱۹۷۵ء)] اِس اشاعت کا متن محبوب المطابع - دہلی کی اشاعت (۱۳۰۸ھ)، ڈاکٹر غلام مصطفیٰ خان کی اشاعت (۱۹۵۸ء) اور چار خطی نسخوں کے تقابلی مطالعے سے متعین کیا گیا ہے۔

محمد نذیر رانجھا نے مولانا یعقوب چرخی کے رسائل - ابدالیہ، انسیہ، شرح اسماء الحسنیٰ اور حورائیہ [یا جمالیہ]- کے فارسی متن مرتّب کیے ہیں اور اوّل الذکر دو رسائل کو اُردو کا جامہ پہنایا ہے۔

[فارسی متون

ابدالیہ، اسلام آباد: مرکز تحقیقاتِ فارسی ایران و پاکستان (۱۹۷۸ء)

اُنسیہ، اسلام آباد: مرکز تحقیقاتِ فارسی ایران و پاکستان (۱۹۸۳ء)

دو اثر غیر چاپی یعقوب چرخی ("شرح اسماء اللہ الحسنیٰ" اور "حورائیہ")، مجلّہ دانش (اسلام آباد)، شمارہ ۱ (۱۴۰۵ھ)، ص ۱۲ - ۴۷

اُردو تراجم

ابدالیہ، لاہور: اسلامک بک فاونڈیشن (۱۹۷۸ء)

اُنسیہ (مع متن)، اسلام آباد: مرکز تحقیقاتِ فارسی ایران و پاکستان (۱۹۸۳ء)]

محمد نذیر رانجھا کی تقدیم و تعلیقات کے ساتھ شیخ محمد عالم صدیقی علوی کا تذکرہ "لمحات فی نفحات القدس" [اسلام آباد: مرکز تحقیقاتِ فارسی ایران و پاکستان (۱۹۸۶ء)] بھی شائع ہوا ہے۔ یہ تذکرہ "شرح احوال و کرامات و اشتغالات و روابطِ بزرگان عارفانِ سلسلہ زکیہ جہریہ سمرقند و بخارا" سے متعلق ہے۔ مؤلف نے جس سلسلۂ تصوف کو "جہریہ" کا نام دیا ہے۔ یہ سلسلۂ خواجگان ہی کی ایک شاخ ہے جس کا نمایاں شعار ذکرِ جہر تھا اور یہ خواجہ محمد یوسف ہمدانی مرشد خواجہ احمد یسوی کی جانب منسوب ہے۔ اِس کے برعکس خواجہ عبدالخالق غجدوانی ذکرِ خفی پر عامل تھے۔[۱۰]

وسطی ایشیا کے نقشبندی صوفیاء کے تراجم کے حوالے سے محمد نذیر رانجھا کے ساتھ پیرزادہ اقبال احمد فاروقی کا ذکر ضروری ہے۔ اُنھوں نے خواجہ محمد پارسا کے رسالہ قدسیہ، مولانا یعقوب چرخی کے رسالہ اُنسیہ، خواجہ عزیزان رامیتنی کے رسالہ شریفہ اور خواجہ عبید اللہ احرار کے رسالہ انفاس نفیسہ کے تراجم "رسائلِ نقشبندیہ" [لاہور: مکتبہ نبویہ (س-ن)] کے نام سے کیے ہیں۔ مولانا یعقوب چرخی کے رسالہ اُنسیہ کا ترجمہ محمد نذیر رانجھا نے بھی کیا ہے۔ دونوں تراجم کے تقابلی مطالعے اور فارسی متن سے مطابقت کرنے سے معلوم ہوتا ہے کہ محمد نذیر رانجھا متن کے زیادہ قریب رہے ہیں۔

© rasailojaraid.com

© rasailojaraid.com

برصغیر پاکستان وہند میں وسطی ایشیا کی سیاست سے دلچسپی کا ایک دور وہ تھا جب ایسٹ انڈیا کمپنی مستقبل کے حکمران کی حیثیت سے اس خطّے کے بارے میں سوچ بچار کر رہی تھی اور جب ۱۸۵۷ء کے بعد اسے شمال مغربی ہند کا اقتدار حاصل ہو گیا تو اس نے اپنے استعماری مقاصد کے تحت جو رویّے اختیار کیے، اس کا جائزہ گزشتہ صفحات میں لیا جا چکا ہے۔

۱۹۱۷ء کے اشتراکی انقلاب نے جہاں دنیا بھر کے اہلِ فکر کو "اشتراکیت" کے بارے میں واضح نقطۂ نظر اختیار کرنے پر آمادہ کیا، وہیں برصغیر پاکستان وہند کے اہلِ فکر نے بھی اشتراکیت کی حمایت، مخالفت یا دو انتہاؤں کے درمیان کا راستہ اختیار کیا۔

برصغیر پاکستان وہند کے مسلمانوں نے بحیثیت مجموعی خدا بیزار فلسفۂ اشتراکیت کو مسترد کیا اور وسطی ایشیا پر اشتراکی تسلط کو مسلمانوں کے لیے تباہ کن قرار دیا۔ استعماری روس کے بالمقابل امام شامل جیسے اہلِ عزم و حوصلہ کے کارناموں کی یاد تازہ کرتے ہوئے اشتراکیت کے خلاف مزاحمتی تحریک کے حق میں آواز بلند کی۔ ایشیاٹک سوسائٹی آف بنگال کے ایک رکن مولوی عبدالولی صدیقی نے "وقائع تسلطِ روسیا بر آسیا" (فارسی) کے نام سے ایک کتاب لکھی اور وسطی ایشیا پر روسی تسلط کو تاریخی تناظر میں دیکھا۔ یہ کتاب مؤلف نے ذاتی طور پر سلکو پہ ضلع جسر (بنگال) سے شائع کی تھی۔

علمائے کرام کا وہ گروہ جو برصغیر کی تحریک آزادی میں "انقلابی" طریقے پر یقین رکھتا تھا اور پہلی عالمی جنگ کے دوران میں اُس نے جرمنی اور افغانستان کے تعاون سے آزادی کا خواب دیکھا تھا، اشتراکی انقلاب کے بعد اُس کی خوشی کی حد نہ رہی۔ اِن علماء کے نقطۂ نظر کو تقویت اشتراکی رہنماؤں کے اس رویّے سے ملی کہ انھوں نے خفیہ معاہدوں سے پردہ اٹھا دیا جو اتحادی طاقتوں نے ترکی کے مستقبل کے بارے میں باہم کر رکھے تھے۔ اِن علمائے کرام اور کچھ پُرجوش نوجوانوں نے اشتراکیت کو اسلام کی معاشی تعلیمات کے قریب دیکھا اور اشتراکیت کے الحادی فلسفے کو نظر انداز کرتے ہوئے اسے اسلام کے مترادف قرار دیا۔ مشیر حسین قدوائی، مولانا عبیداللہ سندھی اور مولوی برکت اللہ بھوپالی کی تحریریں اس زاویۂ نظر کی عکاس ہیں۔

کمیونسٹ پارٹی آف انڈیا اور اس کی Front Organizations نے سوویت یونین کے معاشی و سیاسی نظام پر بڑی مقدار میں لٹریچر تیار کیا مگر یہ اشتراکی فلسفہ اور اشتراکی آمریت کی کامیابیوں کی مدح سرائی کے لیے وقف رہا۔ اس میں نہ تو وسطی ایشیا کے مسلمانوں کی تاریخ و ثقافت کو کوئی اہمیت دی گئی اور نہ اُن کے قوم پرستانہ جذبات کی عکاسی کی گئی۔

قیامِ پاکستان کے فوراً بعد نیم سرکاری اداروں، آزاد تنظیموں اور دینی - سیاسی جماعتوں نے اشتراکیت اور سرمایہ داری کے بالمقابل اسلام کے معاشی و سیاسی نظام کے خدوخال پیش کرنے شروع

© rasailojaraid.com

© rasailojaraid.com

کیے۔ مظہر الدین صدیقی، سیّد ابوالاعلیٰ مودودی، خلیفہ عبدالحکیم اور جماعت اسلامی پاکستان کے قلم کاروں کی تحریریں اس ضمن میں قابلِ ذکر ہیں۔ تحریک آزادی کے دوران میں اشتراکی ذہن رکھنے والے دانش وروں اور کمیونسٹ پارٹی نے آل انڈیا مسلم لیگ کے نقطۂ نظر کی کبھی حمایت نہ کی تھی البتہ انہیں انڈین نیشنل کانگرس کی "اشتراکیت" سے دلچسپی رہی، تاہم تحریک آزادی کے آخری مرحلے میں، جب تقسیمِ ہند نمایاں طور پر نظر آرہی تھی، اشتراکی دانش ور ادھیکاری نے برصغیر کی "مسلم قومیت" کو تسلیم کرتے ہوئے اشتراکی قومیتی فلسفے میں اسے جگہ دی۔ قیامِ پاکستان کے بعد بھی اشتراکی ذہن نے قیام پاکستان کی بنیاد یعنی دینی شناخت کو تسلیم نہ کیا اور وہ مزدوروں کو "سرخ سویرے" کے نام پر منظم کرنے میں کوشاں رہے۔ پاکستان کے ابتدائی برسوں میں، کچھ پاکستان کی جانبدارانہ خارجہ پالیسی اور کچھ روس کے اپنے تعصّبات کے تحت، سوویت یونین نے بین الاقوامی سطح پر آزاد ہندوستان کا ساتھ دینے کا فیصلہ کیا اور یوں پاکستان میں اشتراکی تنظیموں کے لیے سرکاری یا عوامی سطح پر کوئی نرم گوشہ پیدا نہ ہوسکا۔ جن سیاسی جماعتوں نے اپنے منشوروں میں "اشتراکیت" یا "سائنسی اشتراکیت" کو برائے وزن بیت شامل کیا تھا، حقیقتاً وہ بھی مارکسٹ نہیں بلکہ سوشلسٹ ڈیموکریٹ جماعتوں کی حیثیت رکھتی تھیں۔ ان کو جو کچھ بُری بھلی پذیرائی حاصل ہوئی، اس میں اشتراکی فلسفے سے زیادہ ان کے قوم پرستانہ نعروں کی کارفرمائی تھی۔

عوامی جمہوریہ چین کی آزادی اور پھر روس - چین کشمکش کے دور میں جب پاکستان کے تعلقات اپنے ہمسایہ ملک چین سے بہت بہتر ہوگئے اور پاکستان نے اپنے دوست کو "اقوام متحدہ" کی سلامتی کونسل میں لانے اور امریکہ کے ساتھ اس کے روابط استوار کرانے میں کردار ادا کیا تو پاکستان کے اشتراکیوں کو اشتراکیت کے حق میں چین - پاکستان دوستی کی آڑ میں پروپیگنڈے کا موقع ملا، تاہم جماعتِ اسلامی پاکستان اور بعض دوسرے اہل دانش نے اس صورت حال میں یہ بات واضح کی کہ ہمسایہ طاقت سے دوستی اپنی جگہ مگر جس طرح عوامی جمہوریہ چین اپنی آئیڈیالوجی کے خلاف کسی کو بشمول پاکستان، مخالفت کی اجازت نہیں دیتا، اسی طرح پاکستان بھی اپنی اساس یعنی اسلام کے بالمقابل کسی دوسری آئیڈیالوجی کو قبول کرنے کے لیے تیار نہیں۔ اس سلسلے میں جماعت اسلامی پاکستان کے ماہنامہ "ترجمان القرآن" (لاہور) کے اداریہ بابت جون ۱۹۶۸ء نے عوامی سطح پر متوازن نقطۂ نظر کو عام کیا۔[۱۱]

۱۹۷۰ء کے عام انتخابات گو ایک دستور ساز [اور قانون ساز] اسمبلی کے لیے تھے مگر ان انتخابات میں ملک کے معاشی مسائل کو سب سے زیادہ اہمیت حاصل تھی۔ شیخ مجیب الرحمن کی "عوامی لیگ" نے مغربی پاکستان کے ہاتھوں مشرقی پاکستان کے معاشی استحصال کو اپنی انتخابی مہم کا مرکزی مسئلہ بنایا، اسی طرح صدرِ پاکستان محمد ایوب خان کی پروردہ "بے لگام سرمایہ داری" کے نتیجے میں مغربی

© rasailojaraid.com

© rasailojaraid.com

پاکستان میں جو ناہمواری پیدا ہو چکی تھی، اس نے ملک کے غریب طبقے کے لیے "اسلامی اشتراکیت" میں جاذبیت پیدا کی، گویہ جاذبیت نظریاتی سطح پر نہیں تھی بلکہ نئی سیاسی جماعت "پاکستان پیپلز پارٹی" نے اسلام کے اقتصادی نظام کو سوشلزم کے قائم مقام قرار دیا تھا۔

۱۹۶۹ء اور ۱۹۷۰ء کے دو برسوں میں جہاں اشتراکی فلسفۂ حیات، اس کی کامیابیوں اور ناکامیوں، اسلامی نظامِ حیات کے ساتھ اس کے تقابل پر عوامی لٹریچر وجود میں آیا، وہیں عملی سطح پر "وسطی ایشیا" کے مسلمانوں پر اشتراکیت کے جوئے تلے جو کچھ بیت رہی تھی، اس پر بھی لکھا گیا۔ اس دور میں جن اہلِ قلم نے وسطی ایشیا کو اپنے مطالعہ کا مستقل موضوع بنایا، ان میں آباد شاہ پوری، محمد حامد اور ثروت صولت کے نام نمایاں ہیں۔ آباد شاہ پوری کی مختصر کتاب "مسلمان قومیں - اشتراکیت کے سائے میں" اور جامع کتاب "روس میں مسلمان قومیں" نے ایک خلا پُر کیا۔ ادارہ معارفِ اسلامی کراچی کے سیکرٹری، پروفیسر خورشید احمد نے اپنے زیرِ ادارت ماہنامہ "چراغِ راہ" کا سوشلزم نمبر شائع کیا جس میں اسلام اور اشتراکیت کا دو نظاموں کی حیثیت سے تقابلی مطالعہ پیش کیا گیا اور خصوصی شمارے کا ایک حصہ وسطی ایشیا کے مسلمانوں کی حالتِ زار کے لیے مختص تھا۔

آباد شاہ پوری اور پروفیسر خورشید احمد صاحبان کی کاوشوں کے نتیجے میں وسطی ایشیا پر تالیف و ترتیب کو ایک نئی جہت ملی اور آئندہ چند برسوں میں کچھ وقیع مقالات کے ساتھ چند کتابیں سامنے آئیں۔

وسطی ایشیا سے دلچسپی کا ایک پہلو اس خطّے کے سفر ناموں کی اشاعت ہے۔ قیامِ پاکستان سے پہلے آرمینیس ویمبری کی خود نوشت (جس کا بڑا حصہ وسطی ایشیا کی سیاحت پر مبنی ہے) کا ترجمہ "پروفسر ویمبری کا سفر نامہ" قابلِ ذکر ہے۔ آرمینیس ویمبری جسے عثمانی خلیفہ کے دوست ہونے کا دعویٰ تھا اور ترکوں سے اُس کی دلچسپی، نیز مبیّنہ قبولِ اسلام نے برصغیر کے مسلمان اہلِ دانش میں اُس کا عمدہ Image بنا دیا تھا، گو آج ہر شخص جانتا ہے کہ وہ برطانوی جاسوس کے طور پر سفر کرتا رہا تھا اور اُس کا قبولِ اسلام بھی اپنے مقاصد کے حصول کے لیے ایک Trick سے زیادہ کوئی حیثیت نہ رکھتا تھا۔[۱۲]

آرمینیس ویمبری کے علاوہ شوکت عثمانی کا سفر نامہ "میری روس یاترا" اہم ہے۔ یہ ایک ایسے شخص کا سفر نامہ ہے جو سوویت یونین کی آئیڈیالوجی سے نہ صرف متفق ہے بلکہ اسے عام کرنے کے لیے والہانہ جذبہ رکھتا ہے۔ قیامِ پاکستان سے پہلے عشرت علی صدیقی نے اپنی یادداشتیں "لینن گراد تا سمرقند" کے نام سے مرتب کیں مگر انھوں نے کسی نظریاتی لاگ یا لگاؤ کا کوئی ثبوت نہیں دیا بلکہ ایک آزاد خیال، غیر جانبدار سیاح کے طور پر اپنی نگاہ مناظرِ قدرت اور لوگوں کی نشست و برخاست پر رکھی۔ قیامِ پاکستان کے بعد بعض صحافیوں نے سوویت یونین کا دورہ کیا مگر انھیں وسطی ایشیا کی کسی ریاست میں جانے کا اتفاق نہ ہوا، ایسے سفر ناموں کو نظر انداز کرتے ہوئے صرف اُن سفر ناموں پر ایک نظر

© rasailojaraid.com

© rasailojaraid.com

ڈالنا مفید ہے جن میں "وسطی ایشیا" اور یہاں کی مسلم آبادی پر اظہارِ خیال کیا گیا ہے۔

۱۹۵۷ء میں روسی سفارت خانے کی تگ و دو اور خواہش پر جمعیتہ علمائے پاکستان کے ایک وفد نے مولانا عبدالحامد قادری بدایونی کی سربراہی میں سفر کیا۔ مولانا بدایونی نے سفر نامہ "تاثراتِ روس" کے نام سے مرتب کیا جو جمعیتہ علمائے پاکستان نے شائع کیا۔ وفد نے سرکاری پروگرام کے مطابق مزارات، مساجد، کتب خانے اور سرکاری مذہبی ادارے دیکھے۔ ۳۰ جون ۱۹۵۷ء کو وفد تاشقند پہنچا۔ مولانا بدایونی کے الفاظ میں[۱۳]

> حضرت مولانا قاضی ضیاءالدین صاحب ادارۂ دینیہ نے سو علماء و ائمہ مساجد کے ساتھ وفد کا استقبال فرمایا —— تاشقند کی آبادی ایک ملین ہے۔ یہاں بیس مسجدیں ہیں جو سب کی سب آباد ہیں اور بازینت ہیں۔ [لوگ] ازبکی زبان بولتے ہیں۔ بوڑھوں میں نماز کی پابندی کا خاص طور پر شوق و جذبہ ہے، البتہ نوجوانوں میں کم ہے۔ مسلمان کافی خوشحال ہیں، راستے صاف ستھرے ہیں۔ مسلمان عورتوں میں پردہ تقریباً نہیں ہے۔

ایک اور موقع پر "دینی زندگی" کا ذکر ان الفاظ میں ہے۔[۱۴]

> مسجدوں کا انتظام الحمد للہ قابلِ قدر و استحسان ہے۔ ہر قاری خطبات عربی زبان ہی میں پڑھتا ہے، البتہ جمعہ کے خطبے سے قبل پاکستان و ہندوستان کی طرح ایک گھنٹہ ازبکی زبان میں مسائل و احکام بیان کرتے ہیں۔ ماشاءاللہ معلومات و احکام دینی سے باخبر علماء ہیں۔ - مساجد میں مسلمان پوری طرح آزاد ہیں، نماز روزے کا کافی شوق موجود ہے۔

مولانا عبدالحامد بدایونی کے وفد کے ایک رکن مولانا راغب احسن کو ان کے تاثرات سے چنداں اتفاق نہیں تھا۔ مولانا راغب احسن نے کوئی تفصیلی سفر نامہ تو نہ لکھا البتہ ایک تاثراتی مضمون میں واضح کیا کہ[۱۵] "پاکستانی علماء کے وفد کا دورہ آزاد نہیں بلکہ سرکاری نگرانی میں بالکل مقید دورہ تھا —— دراصل وہ ہمیں کم چیزوں کو دکھانا اور کھیلوں، تماشوں اور ضیافتوں میں زیادہ مصروف رکھنا چاہتے تھے۔"

تاشقند کی دینی زندگی کے بارے میں مولانا عبدالحامد بدایونی کے تاثرات اوپر درج کیے جا چکے ہیں، مولانا راغب احسن نے کیا محسوس کیا؟ اُن کے الفاظ میں[۱۶]

> [تاشقند] ترکی سے زیادہ روسی شہر بنا دیا گیا ہے۔ وقت کا بیشتر حصہ دس گیارہ پرانی مسجدوں اور قبرستانوں کے دکھانے میں صرف کر دیا گیا حالانکہ ان مسجدوں میں صرف چند سفید ریش نہایت بوڑھے نمازی تھے۔ نوجوان نہ ہونے کے برابر تھے اور لڑکے تو بالکل نہ تھے۔

© rasailojaraid.com

© rasailojaraid.com

مولانا راغب احسن نے روسیوں کی سادگی، مہمان نوازی اور پُر جوش گرم دلی کی بے پناہ تعریف کرتے ہوئے لکھا ہے کہ "روسی عوام قابلِ محبت قوم ہے۔ ان میں مغربی یورپ کی قوموں جیسا احساس برتری نہیں ہے۔"

بعض حضرات کو "وسطی ایشیا" کے اکا دکا شہر دیکھنے کا موقع ملا مگر اُنہوں نے مستقل سفر نامے لکھنے کے بجائے اپنی خود نوشت تحریروں میں اپنے تأثرات شامل کیے ہیں۔ سیّد ذوالفقار علی بخاری کو "باکو" جانے کا اتفاق ہوا۔ یہاں کے کتب خانے کے بارے میں لکھتے ہیں۔[17]

> ایک بات میں نے ایسی دیکھی کہ روسیوں کے جذبۂ حب الوطنی کی داد دینا پڑی۔ اس کتب خانے میں دُنیا بھر کی ہر وہ کتاب موجود ہے جس میں کسی نہ کسی طرح آذربائی جان کا ذکر آیا ہے۔ نہ صرف یہ بلکہ اس کتاب کے مصنّف کی تصویر بھی موجود ہے۔ ایک ولولہ اٹھا کہ لاہور، پشاور، ملتان، ٹھٹھہ اور ڈھاکے کا تذکرہ دُنیا بھر کی کتابوں میں موجود ہے، ہم بھی اگر وہ کتابیں اکھٹی کریں جن میں ان شہروں کا تذکرہ ہے تو شاید ہمارے نوجوانوں کو بھی اِس امر کا احساس ہو کہ ہم بھی کچھ تھے اور ہم بھی کچھ بن سکتے ہیں۔

برصغیر پاکستان و ہند سے "وسطی ایشیا" جانے والوں کے ذکر کے ساتھ وسطی ایشیا سے آنے والے سیاحوں کا ذکر بھی مناسب ہو گا۔ اگرچہ اِن سیّاحوں کی سفری یادداشتیں یا سفر نامے اُردو میں مستقل نہیں ہوئے اور اُن کے تأثرات سے اُردو خواں طبقہ ابھی تک ناواقف ہے۔ انیسویں صدی کے سیاحوں میں سے ایک حاجی زین العابدین مستعلی شاہ شروانی تھے۔ حاجی زین العابدین نے ترکی، ایران، عراق، مصر، اور خلیج فارس کی ریاستوں کے ساتھ برصغیر کی سیاحت کی تھی اور اپنی یادداشتیں "ریاض السیاحت" اور "بستان السیاحت" کے نام سے قلمبند کی ہیں۔ "بُستان السیاحت" (تالیف ۱۲۴۷ھ/۳۲-۱۸۳۱ء) ایران سے شائع ہو چکی ہے جس میں سیاح مؤلف نے اپنے دیکھے ہوئے شہروں کا حروف تہجی کی ترتیب سے ذکر کیا ہے اور اپنے تأثرات قلمبند کیے ہیں۔ ڈھاکہ سے متعلق حصہ کا ترجمہ سہ ماہی بصائر (کراچی) میں شائع ہوا ہے۔[18]

"وسطی ایشیا" کے خطّے سے اسلامی تاریخ و تہذیب کے سیکڑوں "رجال" اُبھرے جن کے کارنامے رہتی دُنیا تک جگمگاتے رہیں گے۔ تفسیرِ قرآن ہو یا حدیث رسول ﷺ، فلسفہ ہو یا علم کلام، تاریخ ہو یا ادب، ہر شعبۂ علم میں "وسطی ایشیا" کا حصہ وقیع ہے۔ "الجامع الصحیح" کے مرتب امام بخاری اور "جامع ترمذی" کے جمع کنندہ امام ابو عیسیٰ محمد ابن عیسیٰ اسی خطّے کے گل ہائے سر سبد ہیں۔ اُن کی تالیفات سے نہ صرف برصغیر بلکہ پورے عالم اسلام میں یکساں طور پر اعتناء کیا گیا ہے، مگر یہ بھی حقیقت ہے کہ "الجامع الصحیح" ہو یا "جامع ترمذی"، انہیں وسطی ایشیا کے حوالے سے نہیں بلکہ حدیث

© rasailojaraid.com

© rasailojaraid.com

رسول ﷺ کی حیثیت سے پڑھا گیا ہے چنانچہ ان کتب کی جو شروح اور حواشی لکھے گئے، اُن میں حدیث اور فنِ حدیث و رجال کو زیادہ اہمیت حاصل رہی ہے۔

متکلمین میں امام ماتریدی سے کون واقف نہیں۔ فقہ حنفی کے بیسیوں متون وسطی ایشیا کی درس گاہوں میں وجود میں آئے۔ "ہدایہ" جو فقہ حنفی کی متداول کتاب ہے، یہیں کے ایک عالم علامہ مرغینانی کی تالیف ہے، تاہم برصغیر میں وسطی ایشیا کی جس شخصیت کو بطور شخصیت سب سے زیادہ اہمیت حاصل ہوئی، وہ بوعلی سینا ہے۔[19] دوسرے نمبر پر البیرونی توجہ کا مرکز رہا ہے۔[20] اسی طرح دوسرے علوم و فنون کے حوالے سے "وسطی ایشیا" کے بیسوں اہل علم تحقیق و مطالعہ کا موضوع رہے ہیں۔

آخر میں ایک نظر اُن اداروں پر بھی ڈال لی جائے جو "وسطی ایشیا" کو موضوع تحقیق بنائے ہوئے ہیں۔

*انسٹی ٹیوٹ آف سنٹرل اینڈ ویسٹ ایشین اسٹڈیز۔ کراچی

۱۹۶۸ء میں ڈاکٹر سید حسام الدین راشدی، ڈاکٹر اشتیاق حسین قریشی، ممتاز حسن اور بعض دوسرے اہل علم نے وسطی اور مغربی ایشیا کی تاریخ، آثار قدیمہ، فلسفہ، ادب، ثقافت اور معاشی و سماجی اداروں کے بارے میں مطالعہ و تحقیق کو فروغ دینے کے لیے اس ادارے کی بنیاد رکھی۔ گزشتہ ۲۵ برسوں میں انسٹی ٹیوٹ کو وسطی اور مغربی ایشیا کے اہل علم میں خوب پذیرائی حاصل ہوئی ہے۔ ادارے کے سیکرٹری اور روح رواں پروفیسر ریاض الاسلام ہیں جو قرونِ وسطی کی مسلم تاریخ پر گہری نظر رکھتے ہیں۔

انسٹی ٹیوٹ کی جانب سے اب تک جو مطبوعات شائع ہوئی ہیں، ان میں وسطی ایشیا اور برصغیر پاکستان و ہند کے حوالے سے مطربی الاصم سمرقندی کا تذکرۃ الشعراء (تالیف: ۱۶۳۵ء) اور جہانگیر کے ساتھ اُس کی ملاقاتوں کی یادداشتیں "خاطراتِ مُطربی" کے نام سے یکے بعد دیگرے ۱۹۷۶ء اور ۱۹۷۷ء میں شائع ہوئیں۔ تذکرۃ الشعراء اور خاطراتِ مطربی دونوں کتابیں تاجک فاضل مرحوم عبدالغنی میرزایف نے مرتب کی تھیں۔

مولانا مُطربی کے بعد محمد بن امیرولی بلخی شاہجہاں کے دور میں برصغیر پاکستان و ہند میں وارد ہوا تھا۔ واپس اپنے وطن جا کر محمد بن امیرولی بلخی نے اپنے تاثرات کو کتاب "بحرالاسرار فی معرفتہ الاخیار" کا حصہ بنا دیا۔ بحرالاسرار میں مؤلف نے وحدانیت خداوندی، ہیئت اور طبیعی علوم کے ساتھ جغرافیائی معلومات اور حضرت آدم علیہ السلام سے لے کر جنوبی ایشیا اور وسطی ایشیا کے بعض خطّوں میں معاصر حکمرانوں

© rasailojaraid.com

© rasailojaraid.com

کے حالات درج کیے ہیں۔ پروفیسر ریاض الاسلام نے کتاب کا وہ حصہ مرتّب کیا ہے جو برصغیر اور سیلون کی سفری یادداشتوں سے متعلق ہے۔[21]

ایک اور تاریخی متن "جامع التواریخ حسنی" ہے جسے ایرانی فضلاء حسین مدرسی طباطبائی اور ایرج افشار نے انسٹی ٹیوٹ کے لیے مرتب کیا ہے۔ یہ تیمور کے جانشینوں کے حالات میں تاج الدین حسن بن شہاب یزدی کی تالیف (۸۵۵ - ۸۵۷ھ/۱۴۵۱ء - ۱۴۵۳ء) ہے۔

*مرکز تحقیقاتِ فارسی ایران و پاکستان۔ اسلام آباد

مرکز تحقیقات فارسی ایران و پاکستان کا اوّلین تصوّر صدرِ پاکستان کے دورۂ ایران کے موقع پر دونوں ملکوں کے سربراہوں کے مشترکہ اعلامیہ (۴ نومبر ۱۹۶۹ء) میں پیش کیا گیا تھا، تاہم سرکاری سطح پر تفصیلات طے ہونے کے بعد تصوّر نے ۲۳ اکتوبر ۱۹۷۱ء کو عملی شکل اختیار کی۔ ابتداءً مرکز نے راولپنڈی میں ایرانی فاضل ڈاکٹر علی اکبر جعفری کی سرکردگی میں کام شروع کیا۔ مرکز نے حضرت علی ہجویری معروف بہ داتا گنج بخش لاہوری کے نام پر "کتاب خانہ گنج بخش" قائم کیا اور مطبوعہ کتابوں کے ساتھ مخطوطات جمع کرنے کی مہم شروع کی۔ کتب خانے کے اوّلین ناظم محمد حسین تسبیحی نے مختصر مدّت میں ہزاروں مخطوطات حاصل کر لیے۔ مرکز کے ذخیرۂ مخطوطات میں ایک معقول تعداد ایسی کتابوں کی ہے جو وسطی ایشیا کے اہل قلم کی کاوش ہیں یا ان نسخوں کی کتابت وسطی ایشیا میں ہوئی ہے۔[22] فارسی مخطوطات کی فہرست آقائی احمد منزوی نے چار جلدوں میں مرتّب کی ہے۔[23] عربی مخطوطات کی مجمل فہرست بھی ایران سے شائع ہو گئی ہے۔

مرکز نے ایران و پاکستان کے علمی و ادبی اور ثقافتی روابط کے حوالے سے فارسی زبان کی کم و بیش ایک سو کتابیں شائع کی ہیں۔ آقائی احمد منزوی نے پاکستان کے سرکاری اور نجی کتب خانوں میں موجود فارسی مخطوطات کی ایک جامع فہرست تیرہ ضخیم جلدوں میں مرتب کی ہے جس میں سیکڑوں ایسے مخطوطات کی نشاندہی کی گئی ہے جو وسطی ایشیا کے اہل قلم کی یادگار ہیں۔

مرکز تحقیقات فارسی نے سلسلہ خواجگان کا تذکرہ "لمحات من نفحات القدس" (محمد عالم صدیقی علوی)، حافظ الدین محمد بخاری کی غیر مطبوعہ لغت قرآن "المستخلص" اور علی بن محمد الادیب الکرمینی کی "تکملتہ الاصناف" شائع کی ہیں۔ یہ تینوں کتابیں وسطی ایشیا میں لکھی گئی تھیں اور اوّل الذکر کا تعلق وہیں کے صوفیاء سے ہے۔

مرکز نے خواجہ محمد یعقوب چرخی کے رسائل ابدالیہ اور اُنسیہ شائع کیے۔ اسی طرح خواجہ محمد پارسا کے رسالہ قدسیہ کا ایک اچھا ایڈیشن مرکز کی کوشش سے سامنے آیا ہے۔[24]

© rasailojaraid.com

© rasailojaraid.com

*ایریا اسٹڈی سنٹر (سنٹرل ایشیا)، پشاور یونیورسٹی - پشاور

۱۹۶۰ء کے عشرے کے آخر میں پشاور یونیورسٹی میں "وسطی ایشیا" کے عوام کی تاریخ و ثقافت، معیشت و تجارت اور ادب و فن کے مطالعہ کے لیے ایریا اسٹڈی سنٹر قائم کیا گیا۔ سنٹر تصنیف و تالیف کے ساتھ درس و تدریس کی سہولتیں مہیا کرتا ہے۔ ایم - اے، ایم - فل اور ڈاکٹریٹ کی سطح کے لیے علمی راہنمائی اور تحقیقی وسائل موجود ہیں۔ وسطی ایشیا کے متخصص ڈاکٹر محمد انور خان سنٹر کے سربراہ ہیں۔

سنٹر کی جانب سے ایک ششماہی مجلہ Central Asia گزشتہ ۲۲ سال سے شائع ہو رہا ہے۔ گزشتہ عشرہ ڈیڑھ میں افغانستان میں روسی مداخلت اور اس کے تحت پیدا ہونے والے حالات کے باعث مجلے میں افغانستان پر زیادہ مقالات اور رپورٹیں شائع ہوئی ہیں۔ مجلے میں تاریخ، جغرافیہ، معاشیات اور عمرانیات کے حوالے سے بعض وقیع مقالات شائع ہوئے ہیں۔

*انسٹی ٹیوٹ آف پالیسی اسٹڈیز - اسلام آباد

۱۹۷۹ء میں انسٹی ٹیوٹ آف پالیسی اسٹڈیز کی بنیاد رکھی گئی۔ پروفیسر خورشید احمد انسٹی ٹیوٹ کے بانی چیئرمین ہیں۔ انسٹی ٹیوٹ پاکستان بلکہ عالمِ اسلام کے اُن چند گِنے چُنے اداروں میں سے ہے جو غیر سرکاری سطح پر امت مسلمہ کے مسائل و حالات کا جائزہ لیتے ہیں۔ انسٹی ٹیوٹ نے روزِ اوّل سے افغانستان اور وسطی ایشیا میں ہونے والی سیاسی تبدیلیوں کو اپنی تحقیق اور مطالعے کا موضوع بنایا ہے۔ اس سلسلے میں افغانستان پر متعدّد سیمیناروں کے انعقاد اور رپورٹوں کی اشاعت کے علاوہ انسٹی ٹیوٹ نے وسطی ایشیا پر آبادشاہ پوری کی دو کتابیں "ترکستان میں مسلم مزاحمت" اور "مسلم امّہ - سوویت روس میں" شائع کی ہیں۔

انسٹی ٹیوٹ نے ۱۹۹۱ء میں اسلامک فاونڈیشن (لیسٹر - برطانیہ) کے دوماہی جریدہ Soviet Brief کا ترجمہ "اشتراکی دنیا کے مسلمان" کے نام سے شائع کرنا شروع کیا تھا جس کے چھ شمارے شائع ہو سکے۔ گزشتہ سال سے انسٹی ٹیوٹ کی جانب سے زیرِ نظر مستقل بالذات دوماہی جریدہ "وسطی ایشیا کے مسلمان" باقاعدگی سے شائع ہو رہا ہے۔

*سنٹر فار دی اسٹڈی آف سنٹرل ایشین سویلائزیشن - قائداعظم یونیورسٹی۔ اسلام آباد

چھٹی سے تیرہویں صدی کے دوران میں وسطی ایشیا میں جنم لینے والے سائنس دانوں نے جو کارہائے نمایاں انجام دیے تھے، وہ انسانیت کی میراث ہیں۔ اس حقیقت کے تحت ۱۹۶۶ء میں یونیسکو کے عمومی اجلاس میں طے کیا گیا کہ وسطی ایشیا کے اِن اہلِ علم کے کارناموں کو عالمی سطح پر پوری

© rasailojaraid.com

© rasailojaraid.com

اہمیت دی جائے۔

اِس قرارداد کی روشنی میں ۱۹۶۷ء میں یونیسکو کے زیر اہتمام "سائنس کی ترقی میں وسطی ایشیا کے کردار" پر بین الاقوامی سیمینار منعقد ہوا اور یہی کوششیں "سنٹر فار دی اسٹڈی آف سنٹرل ایشین سویلائزیشن" کے قیام کا باعث بنیں۔ معروف فاضل احمد حسن دانی کی نگرانی میں یونیسکو کا یہ ادارہ کام کر رہا ہے۔ وسطی ایشیا کی شخصیات کے کارناموں پر سیمیناروں کے علاوہ "سنٹر" کی طرف سے بعض کتابیں شائع ہوئی ہیں جن میں آثارِ قدیمہ اور بشریات کو زیادہ اہمیت دی گئی ہے۔

۱۹۷۸ء سے سنٹر ایک شش ماہی مجلہ Journal of Central Asia باقاعدگی سے شائع کر رہا ہے۔ ۱۹۸۲ء میں جرنل کے دونوں شمارے یکجا شائع ہوئے جو ترکی زبان میں وسطی ایشیا کی ایک جامع کتابیات پر مشتمل ہیں۔

حواشی

۱۔ ڈاکٹر سیّد عبداللہ، مقالہ "تُوزکاتِ تیموری"، فارسی زبان و ادب، مجلسِ ترقی ادب (۱۹۷۷ء)، ص ۱۶۹-۱۷۷

۲۔ "ظفر نامہ" نام اتنا مقبول ہوا کہ بعد کے کئی مورخین نے اپنے ممدوحین کی عسکری کامیابیوں کے ریکارڈ کو ظفر نامے کا نام دیا۔ "ظفر نامہ شاہجہاں"، "ظفر نامہ عالمگیری" اور "ظفر نامہ رنجیت سنگھ" سے اہل علم واقف ہیں۔

۳۔ وزیر الحسن عابدی، دیباچہ یادداشتہائے مولوی محمد شفیع راجع بہ تیمور و عہد وی، لاہور: مجلس ترقی ادب (۱۹۷۸ء)، ص "کب"

۴۔ زین خان خوافی، طبقات بابری [انگریزی ترجمہ: سیّد حسن عسکری]، دہلی: ادارہ ادبیات (۱۹۸۲ء)، ص ۷۷-۸۱

۵۔ محمد صابر، ترک اور برصغیر، ماہ نو (کراچی)، جون ۱۹۶۵ء، ص ۱۵

۶۔ محمد غوثی شطاری مانڈوی، اذکارِ ابرار [ترجمہ: فضل احمد جیوری]، لاہور: اسلامک بک فاونڈیشن (۱۹۷۵ء)، ص ۳۳۲

۷۔ خواجہ ابوالعلاء نقشبندی پر متعدد کتابیں شائع ہو چکی ہیں۔ ان کی سوانح حیات اور کتابیات کے لیے دیکھیے: سخاوت مرزا قادری، قدوۃ العارفین حضرت امیر ابوالعلاء نقشبندی اکبر آبادی، الولی (حیدرآباد-سندھ)، مارچ ۱۹۷۵ء، ص ۳۳۹-۳۴۴، اپریل-مئی ۱۹۷۵ء، ص ۱۷-۴۴

۸۔ اقتدار حسین صدیقی، Tarikh-i Manazil-i Bukhara: A Source for the

© rasailojaraid.com

© rasailojaraid.com

History of Central Asia during the First Decades of the 19th Centary، سہ ماہی Studies in Islam (دہلی)، جولائی ۱۹۸۰ء، ص ۱۳۴

۹۔ برصغیر پاکستان و ہند میں تصوّف کے مخطوطات کے لیے دیکھیے: خدا بخش لائبریری جرنل (پٹنہ)، شمارہ ۶۹ - ۷۴ (۱۹۹۲ء)

۱۰۔ خواجہ محمد یوسف ہمدانی، خواجہ عبدالخالق کے مرشد تھے، مگر پیر اور مرید نے الگ الگ انداز نظر اختیار کیا۔ نور بخش توکلی نے اس کی وضاحت میں لکھا ہے۔ "کہتے ہیں کہ حضرت خواجہ خضر آپ کے پیر سبق ہیں اور خواجہ یوسف ہمدانی پیر صحبت و پیر خرقہ۔ اگرچہ خواجہ یوسف اور ان کے مشائخ ذکر بالجہر کیا کرتے تھے لیکن چوں کہ خواجہ عبدالخالق کو ذکر خفیہ کی تلقین حضرت خضر سے تھی اس لیے خواجہ یوسف نے اس میں ردو بدل نہیں کیا بلکہ فرمایا کہ جس طرح تم کو تلقین ہوئی ہے، کیے جاؤ۔" [تذکرہ مشائخِ نقشبندیہ، لاہور، نوری بک ڈپو (۱۹۷۶ء)، ص ۷۵ - ۷۶]

۱۱۔ یہ اداریہ اسی عرصے میں پمفلٹ کی صورت میں بھی شائع ہو گیا تھا۔ دیکھیے: دوستی یا ذہنی غلامی: جماعت اسلامی کا موقف، ملتان: ادارہ مطبوعات جماعت اسلامی (۱۹۶۸ء)

۱۲۔ پروفیسر آرمینیس ویمبری کے احوال و آثار کے لیے دیکھیے: "لوری ایلڈر" اور "رچرڈ ڈالبی"، The Dervish of Windsor Castle: The Life of Arminius Vambery، لندن: بیچ مین اینڈ ٹرنر (۱۹۷۹ء)

منشی محبوب عالم نے ۱۹۰۰ء میں یورپ کا سفر کیا تو بوڈاپسٹ میں پروفیسر ویمبری سے ملاقات کی کوشش کی مگر پروفیسر ویمبری کے گھر پر موجود نہ ہونے کے باعث ملاقات سے محروم رہے۔ [سفر نامہ یورپ، بلاد روم، شام و مصر، لاہور: ڈیسنٹ پریس (۱۹۲۵ء)] تاہم سفر سے واپسی پر انہوں نے پروفیسر ویمبری کی خود نوشت Arminius Vambrey: His Life and Adventures by Himself کے نظر ثانی شدہ ایڈیشن (لندن: ۱۸۸۶ء) کا ملخص ترجمہ شائع کیا۔

منشی محبوب عالم کے بعد ۱۹۰۶ء میں شیخ سر عبدالقادر مدیر "مخزن" (لاہور) کا بوڈاپسٹ جانا ہوا تو وہ پروفیسر ویمبری سے مل کر آئے اور قارئین "مخزن" کو انہوں نے بتایا کہ

> پروفیسر ویمبری انگلستان میں اور دیگر ممالکِ یورپ میں مشرقی معاملات کے متعلق عموماً اور اسلامی معاملات کے متعلق خصوصاً نہایت باخبر مانے جاتے ہیں اور گو کئی دفعہ ہمیں ان سے رائے میں اختلاف ہوا ہے، تاہم اس امر کا اعتراف کرنا فرض ہے کہ بہ اعتبار مغربی نژاد ہونے کے ان کی معلومات تعجب خیز ہیں گی [انتخابِ مخزن، لاہور، شیخ مبارک علی تاجرِ کتب (س - ن)، ص ۹۹ - ۱۰۰]

شیخ عبدالقادر کو پروفیسر ویمبری نے اپنی کتابیں دکھائیں اور کتابوں کے بارے میں باتیں ہوتی

© rasailojaraid.com

© rasailojaraid.com

رہیں۔ شیخ عبدالقادر کے بیان کے مطابق لارڈ کرزن کے اُن کے شاگرد تھے اور ڈاکٹر آریل سٹائن بھی ان سے شرف تلمذ رکھتے تھے اور "لارڈ کرزن کے عہد میں ان کو جو عہدہ وسط ایشیا میں تحقیقات وغیرہ کا سرکار کی طرف سے ملا تھا، اس میں غالباً پروفیسر صاحب کی سفارش کو بھی دخل تھا۔"

ڈاکٹر آرل سٹائن (م ۱۹۴۳ء) بھی ہنگری کے رہنے والے تھے، گو انہیں برطانوی شہریت حاصل تھی۔ "وسطی ایشیا" میں مشرقی ترکستان ان کی اثری تحقیقات کا موضوع تھا۔ حالات کے لیے دیکھیے: جینٹ مرسکی، Sir Aurel Stein: Archaeological Explorer، شکاگو: یونیورسٹی آف شکاگو پریس (۱۹۷۷ء)

لارڈ کرزن کے جانشینوں اور آرل سٹائن کے باہمی روابط کی بعض جھلکیوں کے لیے دیکھیے: مارٹن گلبرٹ، Servant of India، لندن: لانگ میز (۱۹۶۶ء)، ص ۶۱ - ۷۳

۱۳۔ محمد عبدالحامد بدایونی، تاثراتِ روس، کراچی: دفتر مرکزی جمعیۃ علمائے پاکستان (۱۹۵۷ء)، ص ۱۷

۱۴۔ ایضاً، ص ۲۸

۱۵۔ راغب احسن، روس میں کیا دیکھا، تحریک (دہلی)، جنوری ۱۹۵۸ء، ص ۲۱

۱۶ ایضاً، ص ۲۲

۱۷۔ سیّد ذوالفقار علی بخاری، سرگزشت، کراچی: معارف لیمٹڈ (۱۹۶۶ء)، ص ۴۰۵

۱۸۔ شریف الحسن (مترجم)، آذربائیجانی سیاح - ڈھاکہ میں، بصائر (کراچی)، اکتوبر ۱۹۶۷ء، ص ۳۲ - ۴۱

۱۹۔ حکیم سیّد ظل الرحمن کی مرتبہ فہرست "مطبوعات ابن سینا" [خدا بخش لائبریری جرنل (۲۴) بابت ۱۹۸۳ء، ص ۱۰۵ - ۱۱۰] سے معلوم ہوتا ہے کہ بوعلی سینا کی بعض کتابیں صرف برصغیر پاکستان و ہند میں شائع ہوئی ہیں اور بعض دوسرے ممالک کے ساتھ ساتھ یہاں بھی چھپی ہیں اور ان کے انگریزی اور اُردو تراجم کیے گئے ہیں۔

۲۰۔ البیرونی سے برصغیر کے اہل علم کے اعتناء کے سلسلے میں دیکھیے: محمد اکرام چغتائی، آثار البیرونی، لاہور: سٹوڈنٹ کارنر (۱۹۷۶ء)، آثار البیرونی (اضافات)، صحیفہ (لاہور)، مئی - جون ۱۹۷۸ء)، ص ۱ - ۴۰

۲۱۔ "بحر الاسرار فی معرفتہ الاخیار" کا ایک حصہ پاکستان ہسٹاریکل سوسائٹی۔ کراچی کی جانب سے ۱۹۸۴ء میں شائع ہوا ہے۔

۲۲۔ ڈاکٹر محمد انور خان، Central Asian Manuscripts in Pakistan، دو ماہی مجلّہ The Varsities (کراچی)، جلد ۲ (۱۹۷۷ء)، ۳۴ - ۳۵

۲۳۔ احمد منزوی، فہرست نسخہ ہای خطی فارسی کتاب خانہ گنج بخش، اسلام آباد: مرکز تحقیقات فارسی ایران و پاکستان، جلد اوّل (۱۹۷۸ء)، جلد دوم (۱۹۷۸ء)، جلد سوم (۱۹۸۰ء) اور جلد چہارم (۱۹۸۲ء)

۲۴۔ مفصل تعارف اور مطبوعات کے لیے دیکھیے: ڈاکٹر علی اکبر جعفری، تحقیقات فارسی در پاکستان، راولپنڈی: مرکز تحقیقات فارسی ایران و پاکستان (۱۹۷۴ء)، سیّد مہدی غروی، نخستین کارنامہ مرکز تحقیقاتِ فارسی ایران و پاکستان، اسلام آباد: مرکز تحقیقاتِ فارسی ایران و پاکستان (۱۳۵۷ھ)

© rasailojaraid.com

© rasailojaraid.com

کتابیات

*اردو، عربی اور فارسی

ا- کتب

آرمینیس ویمبری	پروفیسر ویمبری کا سفرنامہ	لاہور (۱۹۲۸ء)
احمد فزوی	فہرست نسخہ ہائی خطی فارسی کتاب خانہ گنج بخش	اسلام آباد (۱۹۷۸ء - ۱۹۸۲ء)
بوعلی سینا	سیرۃ الشیخ الرئیس	نیویارک (۱۹۷۴ء)
خلیق امر نظامی	تاریخ مشائخِ چشت	اسلام آباد (س - ن)
ذوالفقار علی بخاری، سید	سرگزشت	کراچی (۱۹۶۶ء)
ظہیرالدین بابر	بابر نامہ (اردو ترجمہ)	کراچی (۱۹۶۲ء)
عبدالقادر بدایونی	منتخب التواریخ (اردو ترجمہ)	لاہور (۱۹۶۲ء)
عبدالقادر شیخ	انتخاب مخزن	لاہور (س - ن)
عبداللہ، ڈاکٹر سید	فارسی زبان و ادب	لاہور (۱۹۷۷ء)
علی اکبر جعفری	تحقیقاتِ فارسی در پاکستان	راولپنڈی (۱۹۷۴ء)
محبوب عالم منشی	سفرنامہ یورپ، جلد دوم، شام و مصر	لاہور (۱۹۲۵ء)
محمد اکرام چغتائی	آثار البیرونی	لاہور (۱۹۷۶ء)
محمد اکرام، شیخ	آبِ کوثر	لاہور (۱۹۷۱ء)
محمد ایوب قادری	حضرت مخدوم جہانیاں جہاں گشت	کراچی (۱۹۷۵ء)
محمد عبدالحامد بدایونی	تأثرات	کراچی
ئد غوثی شطاری	اذکارِ ابرار	لاہور (۱۹۷۵ء)
ہدی تمردی	نخستین کارنامہ مرکز تحقیقاتِ فارسی ...	اسلام آباد (۱۳۵۷ھ ش)
نور بخش توکلی	تذکرہ مشائخ نقشبندیہ	لاہور (۱۹۷۶ء)
وزیرالحسن عابدی	یادداشت ہائی مولوی محمد شفیع ...	لاہور (۱۹۷۸ء)

© rasailojaraid.com

© rasailojaraid.com

۲۔ رسائل

ادبی دنیا (لاہور)، مارچ - اپریل ۱۹۶۶ء

اقبال ریویو (کراچی)، جنوری ۱۹۶۷ء

بصائر (کراچی)، اکتوبر ۱۹۶۷ء

تحریک (دہلی)، جنوری ۱۹۵۸ء

خدابخش لائبریری جرنل (پٹنہ)، ۱۹۸۳ء، ۱۹۹۲ء

دانش (اسلام آباد)، فروری ۱۹۹۳ء

ماہ نو (کراچی)، جولائی ۱۹۶۵ء

معارف (اعظم گڑھ)، مئی ۱۹۲۹ء

الولی (حیدر آباد، سندھ)، مارچ ۱۹۷۵ء، اپریل - مئی ۱۹۵۷ء

© rasailojaraid.com